اس لیے زبان وبیان اور خیالات میں جو کور کسر ہے۔ وہ مشق کے بعد رفع ہو جائے گی۔ مجموعی حیثیت سے یہ کتاب مصنف کی بہتر صلاحیت اور اچھے ذوق کا ثبوت ہے۔

اردو کے کلاسیکی شعرا، جلد اوّل :- مرتبہ، جناب ایم، حبیب خاں صاحب، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت اچھی، صفحات ۲۲۰، قیمت ۱۲/۵۰ روپیے۔ پتہ۔ انڈین بک ہاؤس علی گڑھ۔

جناب ایم حبیب خاں لائبریرین کتب خانہ انجمن ترقی اردو ہند نے اردو کے اہم اور بلند پایہ شعرا پر مفید تنقیدی مضامین کا ایک سلسلہ شروع کیا ہے۔ یہ اس کا پہلا حصہ ہے جس میں ولی۔ میر، سودا۔ درد۔ میر حسن۔ مصحفی۔ انشاء، جرأت، ناسخ۔ اور آتش کی شاعری کے اہم پہلوؤں اور نمایاں خصوصیات پر مختلف مشہور اہل قلم کے اچھے اور متوازن مضامین اکٹھا کیے گئے ہیں۔ لائق مرتب نے شروع میں ہر شاعر کے مختصر حالات کے علاوہ اس کے کلام کا نمونہ بھی دیدیا ہے۔ آخر میں دلی و لکھنو کے دبستان شاعری کے عنوان سے ایک مختصر مگر مفید مضمون بھی درج ہے۔ جن شعرا پر اس کتاب میں تنقیدی مضامین درج ہیں۔ لائق مرتب نے ان پر لکھی گئی مفید تنقیدی کتابوں اور مضامین کی فہرست بھی دیدی ہے، تنقیدی مضامین کا یہ مجموعہ طلبہ کیلئے خاص طور پر بہت مفید ہے۔

بچوں کی کہانیاں حصہ اول و دوم | مرتبہ جناب اکبر رحمانی صاحب، تقطیع اوسط، کاغذ، کتابت وطباعت، بہتر صفحات ہر دو حصے ۳۲، قیمت تحریر نہیں، پتہ، مکتبہ آموزگار کاشانہ سہیل، ۳ بھوانی پیٹھ جلگاؤں۔

جناب اکبر رحمانی کو علمی و تعلیمی مسائل سے دلچسپی بھی ہے اور وہ اردو کی خدمت کا جذبہ بھی رکھتے ہیں۔ ان کی کوشش سے جلگاؤں میں ایجوکیشنل اکیڈمی کا قیام عمل میں آیا ہے، اس کے ماتحت اردو میں تعلیمی و تدریسی موضوعات اور بچوں کے ادب پر مفید کتابیں شائع کرنے کا پروگرام بنایا گیا ہے، یہ کتاب اسی سلسلہ کی کڑی اور بچوں کے لیے سبق آموز کہانیوں پر مشتمل ہے، اس سے بچوں میں اردو کے فروغ اور ان کی ذہنی و دماغی نشو و نما میں مدد ملے گی۔

"ض"

جلد ۱۳۸ ماہ محرم الحرام سنہ ۱۴۰۷ھ مطابق ماہ ستمبر سنہ ۱۹۸۶ء عدد ۳

مضامین

مقالات

آثار علمیہ و ادبیہ

وفیات

شذرات

ادھر گذشتہ تین مہینے میں اس برصغیر میں چار موتیں ایسی ہوئیں جن سے علمی حلقے کو بڑا صدمہ پہونچا، ان کی یادیں برابر آتی رہیں گی۔

جناب محمد طفیل اڈیٹر نقوش لاہور اپنے کسی کام سے اسلام آباد آئے، رات کو خوش خوش سوئے تو اپنی میٹھی نیند ہی میں ۵ر جولائی ۱۹۸۶ء کو اللہ کو پیارے ہوئے، اور اپنے بے شمار قدر دانوں کو سوگوار چھوڑ گئے، انھوں نے نقوش کو اپنی ادارت میں ایک علمی فیکٹری بنا رکھا تھا جس طرح کسی فیکٹری سے مشینیں ڈھل کر نکلتی ہیں اسی طرح نقوش سے طرح طرح کے علمی و ادبی خاص نمبر نکلتے رہے، غزل نمبر، افسانہ نمبر، مکاتیب نمبر، خطوط نمبر، شخصیات نمبر، طنز و مزاح نمبر، منٹو نمبر، پطرس نمبر، لاہور نمبر، آپ بیتی نمبر، ادب العالیہ نمبر، ادبی معرکہ نمبر، غالب نمبر، میر تقی میر نمبر، شوکت تھانوی نمبر، میر انیس نمبر اور اقبال نمبر کے علاوہ آخر میں تیرہ[۱۳] جلدوں میں رسول نمبر نکالا، اور قرآن نمبر نکالنے کی فکر میں تھے کہ خود وہاں پہونچ گئے جہاں سے یہ مقدس صحیفہ نازل ہوا تھا،

یہ سارے نمبر علمی، ادبی اور تاریخی انسائیکلوپیڈیا بن گئے ہیں، اس لحاظ سے وہ خوش نصیب تھے کہ ان کا خاتمہ بالخیر رسول نمبر پر ہوا، اس کی تیرہ[۱۳] جلدیں دینی فیض اور علمی برکات کا سرچشمہ بنی رہیں گی، یہ بیسویں صدی میں اردو زبان کا ایسا شاندار کارنامہ ہے جو مدت مدید تک یاد رکھا جائے گا، وہ اپنی دنیاوی زندگی میں لوگوں کو علمی کوثر، ادبی تسنیم اور دینی سلسبیل کے جام پر جام پلاتے رہے، دعا ہے کہ اب جہاں وہ پہونچ گئے ہیں وہاں برکت اخروی کی کوثر، مغفرت الٰہی کی تسنیم اور رحمت ایزدی کی سلسبیل سے سیراب ہوتے رہیں، آمین، وہ اپنے پیچھے یہ درس چھوڑ گئے ہیں کہ عزم، محنت اور حوصلہ ہو تو سرمایہ کی کمی کے باوجود بڑے سے بڑا علمی کام انجام دیا جا سکتا ہے۔

جناب محمد طفیل کی وفات کے کچھ ہی روز بعد جناب قدرت اللہ شہاب کی رحلت کی خبر ملی، وہ برطانوی حکومت کے زمانہ کے آئی۔ سی۔ ایس تھے، ۱۹۴۷ء کے بعد پاکستان کے بڑے بڑے عہدوں پر مامور رہے، وہ جب پاکستان کے گورنر جنرل جناب غلام محمد صاحب کے سکریٹری تھے، تو پہلی بار ۱۹۵۵ء میں

ان سے دارالمصنفین کے دفتری کام کے سلسلہ میں ملا، ایک روز گورنر جنرل ہاؤس میں دوپہر کا کھانا ہوا تو وہ بھی شریک ہوئے لیکن خاموش بیٹھے رہے، ان سے کھانا شروع کرنے کے لیے کہا گیا تو بولے آج شعبان کی پندرہویں تاریخ ہے وہ نفل روزے سے ہیں، ان کی اس مذہبیت کا اثر دسترخوان کے تمام شرکا پر رہا۔

۱۹۵۵ء سے پاکستان کا سفر برابر کرتا رہا، ان سے برابر ملاقاتیں ہوتی رہیں، دارالمصنفین کی مطبوعات کا جب باضابطہ حق طباعت و اشاعت حکومت پاکستان کو دیا جا رہا تھا تو انھوں نے اس کی دفتری کارروائی کرنے میں بڑی سہولتیں پہونچائیں جس کے لیے دارالمصنفین ان کا بڑا ممنون ہوا، ان میں سرکاری افسر کی رعونت بالکل نہ تھی، ہر موقع پر بڑے متین، سنجیدہ اور با اخلاق نظر آئے، بولتے بہت کم تھے مگر سنتے سب کی تھے، اور حتی الامکان مدد کیا کرتے تھے، ان کو انگریزی اور اردو لکھنے میں بڑی مہارت تھی، اردو ادب کا بڑا عمدہ مذاق رکھتے تھے، لیکن اس کا اظہار اپنی گفتگوؤں میں نہ ہونے دیتے، ادبی حلقوں میں اپنی اردو تحریروں کے لیے مقبول تھے، دعا ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ ان کی نیکیوں، لوگوں کے ساتھ گرم گستریوں اور روزمرہ زندگی میں ان کی خوبیوں کی بدولت ان کو اپنی آغوش عفو و کرم میں لے کر وہی جگہ عطا فرمائیں جو نیک بندوں کو اس کی بارگاہ میں ملا کرتی ہے، آمین۔

اگست ۱۹۸۶ء کے شروع میں جناب محمد مسلم صاحب سابق ایڈیٹر روزنامہ دعوت دہلی کی وفات بھی ان کے جاننے والوں کے لیے ایک المناک سانحہ ہے، ان سے تقریباً پون صدی تک برابر ملتا رہا، ہر ملاقات میں ان کی شرافت اخلاق سے متاثر ہوا، ان کا نسبی تعلق سالار مسعود غازی سے تھا، ان کا خاندان دہلی میں آکر آباد ہوا تھا، ۱۸۵۷ء میں ان کے خاندان والے انگریزوں کی نظروں میں معتوب ہوئے، تو وہ بھوپال منتقل ہوگئے، وہیں محمد مسلم صاحب کی پیدائش ہوئی، نوجوانی میں اپنے اسلامی جذبہ کی بنا پر خاکسار تحریک سے متاثر ہوئے، پھر جماعت اسلامی میں شریک ہوگئے، اس حلقہ میں اپنی سوجھ بوجھ کی وجہ سے بڑے قابل قدر سمجھے جانے لگے، جب روزنامہ دعوت کے اڈیٹر ہوئے تو صحافت نگاری میں اپنی اصابت رائے کی وجہ سے

بڑی شہرت حاصل کی، بیرونی ممالک کے سفر پر بھی گئے، اور جب ڈاکٹر سید محمود سابق وزیر مملکت امور خارجہ حکومتِ ہند نے مجلس مشاورت قائم کی تو ان کو جناب محمد مسلم کی سیاسی بصیرت پر بڑا اعتماد رہا، انھوں نے بھی اس میں اپنی مخلصانہ سیاسی سرگرمیوں سے یہ ثابت کر دکھایا کہ وہ سچے مسلمان بھی ہیں اور سچے محب وطن بھی، اس کی تفریق کرنے کی ضرورت نہیں کہ وہ پہلے کیا ہیں، مسلمان یا ہندوستانی، یا ہندوستانی پہلے اور مسلمان بعد میں، سچا مسلمان ہی سچا محب وطن ہو سکتا ہے، ایک طویل علالت کے بعد دہلی میں وفات پائی، انھوں نے جو پاک دل، پاک باطن، اور پاک نفس پایا تھا، ان کی بدولت امید ہے کہ وہ مغفرت الٰہی سے ضرور نوازے جائیں گے، آمین۔

ڈاکٹر سید عبداللہ ۱۴ اگست ۱۹۸۶ء کو لاہور میں اس عالم فانی کو چھوڑ کر عالم جاودانی کو سدھارے، اس خبر کو سن کر دل کو ویسی ہی چوٹ لگی جیسے اپنے خاندان کے کسی عزیز فرد کی دائمی جدائی سے لگ سکتی تھی، ان کی رحلت سے علم و ادب کی ایک زمردیں مسند خالی ہو گئی، وہ علمی حلقوں میں عربی زبان کے قدر شناس، فارسی شعر و ادب کے رمز شناس، اردو کے عناصر خمسہ اور شعراء کے ادا شناس، علامہ محمد اقبال کے جوہر شناس، اور اپنی نظر و فکر کے نکتہ شناس کی حیثیت سے یاد کیے جائیں گے، پاکستان میں اردو کو قومی زبان بنانے میں شاہین اور عقاب بن کر جس طرح جھپٹے، پلٹے اور پلٹ کر جھپٹے اس کی یادیں بھی لوگوں کے دلوں کو گرماتی رہیں گی، ان کی تصانیف سے یونیورسٹی کے اساتذہ نے اردو کے ادیبوں اور شاعروں کو سمجھ کر جس طرح طلبہ کو سمجھایا، اس کی عنبریں یادیں بھی زریں حروف سے لکھی جائیں گی، اور پھر انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کی تکمیل کر کے لوگوں کی دیرینہ آرزوؤں کے ریگزار کو جس طرح شاداب مرغزار بنا دیا، اس کی یادوں کے کنول بھی ہمیشہ کھلے رہیں گے، اور کس کو اس سے انکار ہو سکتا ہے کہ وہ علم و فن کے سیاروں میں عطارد بن کر رہے، اور ساٹھ سال کی علمی خدمت کے بعد اسی حیثیت سے رخصت ہوئے۔

میری یادوں کی شبستان میں وہ اس طرح دکھائی دیں گے کہ وہ مجھ سے مل رہے ہیں، گلے لگا رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ میں تو اپنے کو مولانا سید سلیمان ندوی کا فرزند معنوی سمجھتا ہوں، ان ہی کی تحریروں سے تحقیق کرنا سیکھا ہے، میں تم سے ملتا ہوں تو محسوس کرتا ہوں کہ سگے بھائی سے مل رہا ہوں، ان کی یہ باتیں فردوس گوش بنی ہوئی ہیں، ان پر آیندہ ایک مفصل مضمون لکھ کر اپنا غم ہلکا کروں گا، ابھی تو ہر بُن مو سے ان کی مغفرت کے لیے دعائیں نکل رہی ہیں۔

مقالات

قرآن اور مستشرقین

از

ڈاکٹر التہامی نقرہ صدر شعبۂ قرآن وحدیث کلیۃ الزیتون ٹیونس یونیورسٹی ٹیونس

ترجمہ: عبید اللہ کوٹی، ندوی رفیق دار المصنفین

۳

حداد، جب حضرت عیسیٰؑ کی ان کے رب کے یہاں حیثیت کو ثابت کرنا چاہتا ہے، تو قرآن ہی سے استدلال کرتا ہے، ان لوگوں کی طرح جو قرآن کی کچھ باتوں پر تو ایمان لاتے ہیں اور کچھ دوسری باتوں کا انکار کر دیتے ہیں، مثلاً وہ یہ کہتا ہے کہ مسلمان اگر نفرت و کینہ سے بھری ہوئی تفسیروں سے کنارہ کش ہو جائیں تو وہ یہ دیکھیں گے کہ مسیح، انجیل اور نصاریٰ کے بارے میں قرآنی بیانات مسلمانوں کے لیے بھی فخر و اعزاز کا سبب ہیں"[1]

حداد نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ان معجزات سے بھی انکار کیا ہے جو گذشتہ نبیوں کو دیے گئے تھے[2]، اس کے نزدیک انجیل میں حضرت عیسیٰؑ نے احمد اور فارقلیط سے متعلق جو پیشین گوئیاں کی ہیں، ان سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مراد لینا درست نہیں ہے[3]، وہ یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم

[1] الانجیل فی القرآن ۱۔ [2] الحداد، ص ۸۱، ۲۰۰۔ [3] القرآن والکتاب ص ۶۷۲

عام لوگوں کی طرح پیدا ہوئے، اور اللہ کی طرف سے تفکرات کا بوجھ اتارنے اور شرح صدر کر دینے کے بعد ہی پاک ہوئے [۱]

وہ یہ لکھتا ہے کہ "نبی امیؐ کے دل پر انجیل کا گہرا اثر تھا، ان کے ذوق و وجدان پر مسیح کی شخصیت کے اثرات بڑے دور رس تھے، مسیح کی عظمت ان کے شعور و احساس میں موجزن تھی، چنانچہ انھوں نے قرآن میں مسیح کا تذکرہ، زندۂ جاوید اسلوب میں کیا ہے [۲]" لیکن پھر یہی حداد، اس کے برعکس حیرت اور تعجب کے لہجہ میں یہ سوال کرتا ہے کہ "قرآن کا سرچشمہ کیا تھا؟ اور اس کے بعد اپنے سوال کا جواب دیتے ہوئے لکھتا ہے کہ

قرآن کا پہلا سرچشمہ ذات الٰہی ہے، اور یہ ایک ایمان کا مسئلہ ہے، جس کو چھیڑا نہیں جا سکتا [۳]

حداد کے یہ بیانات علمی اسلوب کے لحاظ سے کس قدر پراگندہ ہیں، اس کے متضاد بیانات اور غیر علمی دعووں کو منطق اور تحقیق سے کیا نسبت ہے۔؟

تدوین قرآن | مستشرقین نے اپنی قرآنی تحقیقات میں جن اعتراضات کا ذکر کیا ہے ان میں سے ایک اعتراض نص قرآنی کے بارہ میں بھی ہے، انھوں نے اس پر اپنے عدم اطمینان کا اظہار کیا ہے، اور اس سے مختلف نتیجے اخذ کئے ہیں۔

اگر نص قرآنی پر سے اعتماد اٹھ جائے، قرآن کی روایت کرنے والوں کی دیانت مشکوک ہو جائے اور یہ شبہ پیدا ہو جائے کہ قرآن اپنی ابتدائی صورت میں، باقی نہیں رہا، تو اس کی ہدایات کی بجا آوری میں جوش، اور تعلیمات قرآنی پر عمل درآمد کا جذبہ بھی رخصت ہو جائے گا۔ اور قرآن پر ایمان و تصدیق کے احساسات بھی کمزور پڑ جائیں گے۔ مستشرقین کی تحقیقات کا بنیادی نصب العین یہی ہے

۱۔ المسیح فی القرآن ص ۱۱۵ ۲۔ ایضاً ص ۲۲۹ ۳۔ القرآن والکتاب ص ۲۵۸

انھوں نے جو شبہات پیدا کئے ہیں، وہ دو بحثوں میں سمٹ جاتے ہیں، جو یہ ہیں۔

۱۔ قرآن کی کتابت اور تالیف

۲۔ قراءتوں کا فرق۔

نص قرآنی کے سلسلہ میں مستشرقین نے کئی اعتراضات کئے ہیں، قرآن کی حفاظت کے لئے جو طریقے اختیار کئے گئے۔ دور نبوت میں تدوین قرآن کی راہ میں ان کے خیال میں جو رکاوٹیں پیش آئیں اور پھر دیگر صحابہ کے قرآنی نسخوں سے نسخۂ صدیقی کا اختلاف، حضرت عثمان ابن عفانؓ کی طرف سے نسخہ صدیقی پر اعتماد، اور یہ دعویٰ کہ اس دور کے بعض مذہبی حلقوں نے مصحف عثمانی کو نظر انداز کر دیا تھا، یا مستشرقین کے بقول، عبد الملک بن مروان کے زمانہ میں، قرآن میں چند ترمیمیں کی گئی تھیں، یہ مسائل پہلی بحث سے تعلق رکھتے ہیں، دوسری بحث کا تعلق اختلاف قراءت سے ہے، جس پر ہم بعد میں روشنی ڈالیں گے۔

فرانسیسی مستشرق بلاشیر (Blachere) اپنے اعتدال اور معروضیت میں ممتاز سمجھا جاتا ہے، لیکن اس نے اپنی کتاب "مدخل الی القرآن" میں اپنی قرآنی تحقیقات کے ضمن میں شک وریب کی فضا پیدا کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں کی ہے۔

اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے نزول آیات کے وقت وحی کو تحریر میں لے آنے کی شدید خواہش پر اپنی بے اطمینانی کا اظہار کیا ہے، اس کے نزدیک چونکہ پہلی بار نزول وحی کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سخت خوف و اندیشہ میں مبتلا ہو چکے تھے، اس لیے یہ ممکن نہ تھا کہ آپ وحی کو لکھ لیا کرتے، مدینہ کے یہود، تحریر و کتابت کے وسائل پر قابض تھے، اور ان سے مسلمانوں کی کشمکش جاری رہی جس سے بلاشیر نے یہ نتیجہ نکالا ہے، کہ دور نبوت میں پورے قرآن کی کتابت نہیں ہو سکی تھی، اور حافظہ کی مدد سے بھی، قرآن کا تحفظ نہیں ہو سکا تھا، اس کے خیال میں یہ ممکن ہے کہ

قرآنی نص کے ساتھ وہ معمولی اضافے بھی خلط ملط ہو گئے ہوں، جن کو آئندہ زمانوں میں قرآن میں شامل کر لیا گیا ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے عہد میں کتابت وحی کے حریص کیوں نہ تھے، یہ دعوی اور کتابت وحی کی خواہش نہ ہونے کے جو اسباب بیان کیے گئے ہیں وہ محض فرضی تخیلات ہیں جو درست نہیں، تحریری وسائل میں کمی و دشواری کے باوجود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کو یادداشت کے ذریعہ محفوظ کیا، لیکن وحی کو ضبط تحریر میں لانے پر بھی آپ نے اسی قدر توجہ دی، یہی وجہ تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خلفاء راشدینؓ، اور ابی بن کعبؓ، زید بن ثابتؓ، اور معاویہؓ وغیرہ جیسے نمایاں ترین صحابہ کرام سے کتابت وحی کا کام لیا، حدیث نبوی سے وحی قرآنی کے اختلاط کے اندیشہ۔ اور تنہا قرآن ہی کے لیے تحریری وسائل کو استعمال کرنے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتداء میں حدیث نبوی کو ضبط تحریر میں لانے سے منع فرما دیا تھا، چنانچہ صحیح مسلم کی روایت کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا کہ:۔

لا تکتبوا عنی غیر القرآن	تم لوگ میری طرف سے روایت کرتے
ومن کتب عنی غیر القرآن	ہوئے قرآن کے سوا کچھ اور نہ لکھو کسی نے
فلیمحہ، وحدثوا عنی ولا	قرآن کے سوا میری طرف سے اور باتیں
حرج۔	لکھ دی ہوں تو وہ انھیں مٹا دے، وہ
	وہ باتیں میری طرف سے زبانی بیان
	کرو، اس میں کوئی ہرج نہیں ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے پہلے ہی چمڑے کی کھالوں اور کھجور کی ٹہنیوں پر پورے قرآن کی کتابت مکمل ہو چکی تھی، وہ ایک مجموعہ میں یکجا نہیں ہوا تھا، لیکن اس کی وجہ

معمولی تھی، قرآن بیسؔ برس سے زیادہ عرصہ میں، تھوڑا تھوڑا نازل ہوا تھا، اس کی ترتیب نزول کے اعتبار سے مقرر نہیں ہوئی تھی، آخری آیت جب آپ پر نازل ہوئی تو اس کے بعد آپ کی زندگی کے چند روز ایک مجموعہ میں قرآن کی کتابت کے لئے کافی نہیں تھے آپ نے قرآن کو سینوں میں محفوظ کر لینے پر بھی توجہ کی لیکن اس سے قرآن کو ضبط تحریر میں لانے کی خواہش اور کوشش پر کوئی اثر نہیں پڑا، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے لوگوں کے پاس موجود، قرآن کے تحریری مواد کو یکجا کیے جانے کا منصوبہ بنایا تو وہ قرآن کی ہر ایک تحریر کا اس قرآن کی نص اور طریق تلاوت سے تقابل کرتے جو لوگوں کی یادداشت میں محفوظ تھا۔ اور صرف وہی تحریری مواد قبول کرتے جس کے بارے میں دو گواہوں نے شہادت دی ہو کہ وہ تحریر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں لکھی گئی تھی۔ (ابوداؤد)

امام بخاری نے اپنی کتاب میں زید بن ثابتؓ کی روایت نقل کی ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے اہل یمامہ کے قتل کے بعد (جس میں ۰۷ قاری شہید ہوئے تھے) ان کو بلا بھیجا، آپ کے پاس حضرت عمرؓ بن خطاب موجود تھے، انھوں نے فرمایا کہ میرے پاس عمر حاضر ہوئے ہیں، انھوں نے یہ کہا ہے کہ یمامہ کے دن قرآن کے قاریوں (حافظوں اور اس کے علوم کے ماہرین) کے قتل کی وجہ سے جنگ تیز ہو گئی ہے، اور مجھے اندیشہ ہے کہ جنگ قاریوں کو ختم کر دے، اور بسہولت قرآن کو یکجا نہ کیا جا سکے، اس لیے میری رائے یہ ہے کہ آپ قرآن کو یکجا کرنے کا حکم دیدیں، اس پر میں نے عمرؓ سے یہ کہا کہ یہ کام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا، پھر ہم کیوں کریں، عمرؓ نے کہا کہ واللہ یہ اچھا کام ہے، وہ مسلسل اصرار کرتے رہے یہاں تک کہ اس کام کے لیے اللہ نے میرا شرح صدر فرمایا۔ اور اس بارہ میں، اب میں عمرؓ کا ہم خیال ہوں، زید بن ثابت کہتے ہیں کہ ان سے حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا کہ آپ جوان عاقل اور قابل اعتماد ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے آپ کتابت وحی بھی کرتے رہے ہیں، اس لیے تحقیق و جستجو سے قرآن مجید کو

یکجا کر دیجیے، زیدؓ کہتے ہیں کہ اگر لوگ کسی پہاڑ کو ادھر سے اُدھر منتقل کرنے کا کام میرے سپرد کر دیتے تو جمع قرآن کی ذمہ داری کے مقابلہ میں وہ میرے لیے زیادہ دشوار نہ تھا، میں نے عرض کیا کہ جو کام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا وہ آپ لوگ کیوں کر رہے ہیں؟ حضرت ابو بکرؓ بار بار مجھ سے وہی بات کہتے رہے۔ یہاں تک کہ حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کو جس کام کے لیے انشراح ہو چکا تھا، اس سے میرا دل بھی مطمئن ہو گیا، پھر میں نے کھجور کی شاخوں، سفید پتھروں پر لکھی تحریروں اور لوگوں کی یادداشت سے جمع قرآن کا کام شروع کر دیا۔ سورہ توبہ کا آخری حصہ (لقد جاءکم رسول من انفسکم۔ تا ختم سورہ) تنہا ابو خزیمہ انصاریؓ ہی کے پاس تھا، قرآن مجید کا یہ نسخہ مختلف اوراق میں ترتیب دیا ہوا، حضرت ابو بکر صدیقؓ کے پاس تھا، پھر حضرت عمرؓ کے پاس آیا پھر حضرت حفصہؓ کے یہاں رہا۔

بلاشیر نے عہد رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں جمع قرآن نہ ہونے پر اپنے مفروضات کی یہ وجہ بتائی ہے کہ:۔

رسول اللہؐ اور آپ کے صحابہ میں تمام معاملات کو جوں کا توں رکھے جانے کا رجحان پایا جاتا تھا، اس کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ عربوں کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ وہ مستقبل کی طرف سے بے فکر ہوتے اور صرف اپنے سامنے گزرنے والے زمانۂ حال ہی کے متعلق سوچ بچار کرتے ہیں، چنانچہ دور نبوت میں اسی رجحان طبع کی وجہ سے مسلمانوں نے جمع قرآن کی طرف توجہ نہیں کی کیونکہ اس وقت اس کی کوئی ضرورت ہی نہ تھی، جیسا کہ انھوں نے قبل از وفات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جانشین طے کرنے کی بھی فکر نہیں کی۔[1]

بلاشیر کے اس نتیجۂ بحث پر جس میں کوئی دلیل نہیں پیش کی گئی ہے، ہم کو سخت حیرت ہوئی

[1] Introduction au Coran 15-36 (Paris 1947)

اس دعویٰ کی دلیل کیونکر ممکن ہے، کہ ایک پوری قوم صرف اپنے زمانۂ حال ہی کے بارے میں سوچتی ہو، ہماری رائے یہ ہے کہ ایک عربی شاعر نے اگر مثال کے طور پر یہ شعر کہا ہے کہ:۔

ما مضی فات والمؤمّل غیب ولک الساعۃ التی أنت فیھا

(جس کام کا وقت گزر گیا وہ رہ گیا، اور جس کی توقع ہے وہ ابھی پردۂ غیب میں ہے تمھارے لیے وہی گھڑی کام کی ہے، جس سے تم گزر رہے ہو)

تو مذکورہ بالا شعر میں ایک متعین حالت سے متعلق انفرادی شعور کا ذکر کیا گیا ہے، جس پر قومی شعور کو قیاس کرنا، یا اس کی روشنی میں پوری قوم پر کوئی حکم لگانا صحیح نہیں ہے، اپنی زندگی میں جانشین مقرر نہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ پیغام الٰہی کی تبلیغ ہی آپ کا بنیادی فرض تھا، جس کی نوعیت خالص مذہبی ہے، اس میں آپ کی جانشینی کی کوئی ضرورت نہیں، اس لیے کہ آپ کے بعد کوئی نبی نہیں ہو سکتا ہے، صرف سیاسی رہنمائی اور جنگی قیادت کا ایک پہلو تھا، جو دعوت اسلامی کی نشر و اشاعت کے لیے بھی زندگی کا ایک لازمی تقاضا تھا، جسکی آپ نے تاکید فرمائی، یہی وجہ ہے کہ آپ نے سیاسی امارت کے تصفیہ کو اپنے بعد آنے والوں کے سپرد کر دیا، ان ہی لوگوں کو اپنے دنیاوی سیاسی امور کو انجام دینا تھا، آپ نے شورائی طریقہ کی تعلیم دی، حاکم کے انتخاب میں اور نظام حکومت کی ترتیب و تنظیم میں امانت و دیانت کی نگہداشت کو آپ نے اپنی تربیت کے ذریعہ ان کی زندگیوں میں محترم اور باوقار حیثیت دیدی تھی، چنانچہ قرآن و سنت میں جو نظام حکومت تجویز کیا گیا ہے، اس میں مذکورۂ بالا تمام امور پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

جانشین کے متعین نہ ہونے کی ایک دوسری وجہ کازانوفا (Casanova) نے اپنی کتاب[1] میں بیان کی ہے۔ لیکن ——— بلاشیر کے مقابلہ میں اس کا دعویٰ اور بھی

[1] محمدؐ و نہایۃ العالم Mohamed et la fin du Monde. P. 6-10

دور انداز کار ہے۔ اس کے بیان کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ یقین تھا کہ ان کے انتقال کے بعد یہ دنیا ختم ہو جائے گی، ان کے انتقال سے پہلے یا اس کے بعد فوراً ہی قیامت آجائے گی۔ اس لیے آپ نے اپنا جانشین مقرر نہیں کیا، کازانوفا لکھتا ہے کہ :-

"محمدؐ جیسے ایک عام عبقری شخص پر نظر ڈالتے ہوئے ہم غیر مسلموں کو یہ بھی وضاحت کرنی ہوگی کہ انھوں نے ایسے اہم کام (جانشینی کے مسئلہ) کی طرف کیوں توجہ نہیں کی، ہم یہ اعلان کرتے ہیں کہ خلافت کے مسئلہ کو نظر انداز کرنے کی وجہ معمولی تھی، ان کا یہ عقیدہ تھا کہ دنیا جلد ہی ختم ہونے والی ہے، حالانکہ یہ ایک خالص مسیحی عقیدہ ہے، لیکن محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنے متعلق یہ دعوی تھا کہ وہی نبی آخر الزمان ہیں، جن کے بارہ میں حضرت عیسیٰؑ نے یہ اعلان کیا تھا کہ وہ آئے گا تاکہ ان کے پیغام کی تکمیل کرے۔"

کازانوفا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں بار بار اصرار کرتا ہے کہ آپ کو دنیا کے جلد ہی ختم ہو جانے کا یقین تھا، اس لیے کہ آپؐ نے ارشاد فرمایا تھا کہ :-

إنني بعثت في زمن كنت أنا والساعة كهاتين وأشار الى سبابته ووسطاه

میں ایسے زمانہ میں بھیجا گیا ہوں کہ میرے اور قیامت کے درمیان ایسا ہی (فاصلہ) ہے جیسے یہ دو انگلیاں، یہ کہکر آپؐ نے انگشت شہادت اور درمیانی دو انگلیوں کی طرف اشارہ فرمایا۔

وہ یہ ثابت کرنا چاہتا ہے، کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلفاء نے قرآن مجید میں ایسی تبدیلیاں کردیں جن سے وہ آپ کی بعثت اور قیامت کے درمیان فاصلہ ثابت کرسکیں حالانکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے

خیال میں جیسا کہ مؤلف کہتا ہے، بعثت نبویؐ اور قیامت دونوں متصل تھے، وہ اس تبدیلی کی ایک مثال یہ دیتا ہے کہ قرآن میں کہا گیا ہے کہ

وَإِنْ مَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِي نَعِدُهُمْ أَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلَاغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ (الرعد - ۴۰)

اور جس بات کا ہم ان سے وعدہ کر رہے ہیں اس میں سے کچھ ہم آپ کو دکھلا دیں یا (اس سے پہلے ہی) آپ کو وفات دیدیں، آپ کے ذمہ تو صرف (احکام کا) پہنچا دینا ہے اور داروگیر کرنا ہمارا کام ہے۔

کازانوفا کا گمان یہ ہے کہ صحابہ کرامؓ نے جب یہ دیکھا کہ قیامت نہیں آئی تو انھوں نے قرآن کے یقینی انداز بیان کو شک کے صیغہ میں تبدیل کر دیا۔ وہ یہ کہتا ہے کہ قرآنی آیت یقینی طور پر اس طرح رہی ہوگی کہ "وَسَنُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِي نَعِدُهُمْ" (ان سے جس چیز کا وعدہ ہے، اس کی چند نشانیاں ہم ان کو جلد ہی دکھادیں گے) مگر کازانوفا .... کا یہ خیال کیا معقول ہے کہ اللہ جو زمان و مکان کا مالک ہے ایک معمولی بات کو ٹھیک سے بیان نہیں کر سکا، وہ اس بات سے بے خبر تھا کہ نبی کا انتقال جلد ہی ہو جائے گا یا وہ دنیا کے خاتمہ تک زندہ رہیں گے، حالانکہ دراصل واقعہ یہ ہے کہ اللہ روز قیامت سے قطعی طور پر باخبر ہے، لیکن اس نے یہ نہیں چاہا کہ انسانوں کو اس کی اطلاع دی جائے۔ کازانوفا نے یہ بھی لکھا ہے۔

"مزید دو آیتیں اور بھی ہیں، جن کے وحی ... ہونے کے بارے میں شک کیا جاسکتا ہے، قرین قیاس بات یہ ہے کہ نبی کی موت کے بعد ابو بکرؓ ہی نے ان دونوں کا اضافہ کیا ہوگا۔ جس کو بعد میں مسلمانوں نے بھی منظوری دیدی، وہ دونوں آیتیں یہ ہیں :- [۱] وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ... (آل عمران ۱۴۴)

---

[۱] (ترجمہ) اور محمدؐ تو رسول ہی ہیں۔ ان سے پہلے اور بھی بہت سے رسول گزر چکے ہیں ...

اور اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عِنْدَ رَبِّكُمْ تَخْتَصِمُوْنَ۔[1] (الزمر ۳۰، ۳۱) کیا ہمیں یہ سمجھنے کا حق نہیں ہے کہ کم از کم دوسری آیت تو پورے طور پر ہی ابوبکرؓ کی ایجاد ہے۔؟"

مذکورہ بالا اقتباس میں اپنے جی سے........ افسانہ کو گھڑنے اور نمایاں کرنے میں اس مستشرق کو یقیناً زحمت ہوئی ہوگی، مگر ہمارے لیے اس کی وضاحت نہایت آسان ہے۔ اس مسئلہ کی وضاحت سے مؤلف کے تمام قیاسات اور نتائج ہوائی ہو کر رہ جاتے ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اگر اپنے انتقال سے پہلے ہی قیامت برپا ہونے کا یقین تھا تو آپؐ نے پرسنل لا، میراث، اجتماعی معاملات اور شخصی قومی و بین اقوامی تعلقات کی تنظیم سے متعلق وسیع طور پر قانون سازی کیونکر فرمائی۔ مدینہ طیبہ میں، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اسلام کی آیندہ زندگی کا گہرا جائزہ اور اس کے بارے میں فکرمندی اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ آپؐ اسلام کے بقاء اور نمو و ارتقاء پر یقین رکھتے تھے، اور سنت الٰہی کے مطابق فنا و زوال سے پہلے اپنی بصیرت کی وجہ سے مستقبل میں اس کے عروج و ارتقاء کو قطعی جانتے تھے۔

کازانوفاہی کی طرح دورِ نبوت میں بھی مخالفین کا ایک گروہ موجود تھا، جو مخالفت کی آگ سے ہر وقت شعلہ بہ پیرہن رہتا تھا لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہوگیا، اور قیامت نہیں آئی، تو کازانوفا کا فریب کارانہ جھوٹ انھیں یاد نہیں آیا حالانکہ وہ اعتراضات کے لئے ہر وقت مستعد رہتے تھے، اور اپنی آتش غضب کو بھڑکانے کے لیے کسی بھی موقع کو کھونا نہیں چاہتے تھے، حضرت ابوبکرؓ نے قرآن میں کچھ ترمیم کی تھی، یا اس میں کچھ اضافہ کیا تھا، تو اس پر صحابۂ کرام نے کیونکر خاموشی

[1] ترجمہ: "آپ کو بھی مرنا ہے، اور ان کو بھی مرنا ہے، پھر قیامت کے دن تم مقدمات اپنے رب کے سامنے پیش کروگے (اس دن عملی فیصلہ ہو جائے گا)"

اختیار کرلی اور کوئی اعتراض نہیں کیا۔ کیا قرآن مجید میں ترمیم اور تحریف کی جرأت وہ شخص کر سکتا ہے، جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صدیق کا لقب دیا ہو۔ اور جس نے خود اپنے بارے میں یہ کہا ہو کہ

أي سماء تظلني وأي أرض	مجھے کون سا آسمان سایہ دے گا
تقلني ان قلت في القرآن	اور کون سی زمین میرا بوجھ اٹھا سکے
برأيي ؟	گی، اگر میں قرآن کی تفسیر میں اپنی
	ذاتی رائے سے دخل دوں ؟

مؤلف نے جن حیلوں کا ذکر کیا ہے کیا دورِ اول کے سب ہی مسلمان بالکل ہی سادہ لوح تھے، کہ وہ ان کا شکار ہو گئے۔ بلکہ کازانوفا نے جو باتیں کہی ہیں، ان کے جواب میں کئی سوالات ابھر کر سامنے آتے ہیں، اس کے بیان کردہ اوہام کی قلعی کھل جائے گی، اگر ہم اصل واقعات کو ایک نظر دیکھ لیں، یہ نظریہ کس قدر مضحکہ خیز ہے کہ مسلمانوں کے عقیدہ کے مطابق دنیا میں انسانی زندگی کا جلد ہی خاتمہ ہونے والا تھا، لیکن جب ان کی سمجھ میں یہ بات آگئی کہ زندگی جلد ختم ہونے والی نہیں ہے تو انھوں نے قرآن کے جمع و تالیف کا کام شروع کر دیا۔ مؤلف نے جس آیت سے استدلال کیا ہے، وہ مشرکین مکہ کے بارے میں نازل ہوئی تھی، جس کی تفسیر یہ ہے کہ ہم نے ان سے جس دنیاوی عذاب کا وعدہ کر رکھا ہے، وہ ہم ان پر آپ کی زندگی ہی میں بھیج دیں یا اس سے پہلے ہی آپ کا انتقال ہو جائے آپ کو اس سے کچھ غرض نہیں، آپ کی ذمہ داری تو یہ ہے کہ پیغام پہنچا دیں اور دین کی امانت ان کے سپرد کر دیں، اور بس، ہم ان کے لیے کافی ہیں، ہم نے آپ سے کامیابی اور نصرت کا جو وعدہ کر رکھا ہے، اس کو ہم پورا کریں گے، اس کی تاخیر چند مصلحتوں کی وجہ سے ہو سکتی ہے جو اگرچہ نظروں سے اوجھل ہیں لیکن ہم ان کو جانتے ہیں اس لئے آپ تنگ دل نہ ہوں۔[2]"

[1] نظرات استشراقیہ فی الاسلام: محمد غلاب ص ۹۹-۱۱۳ [2] اس آیت کی تشریح کے لیے دیکھئے تفسیر نودی۔

مولف نے ایک اور آیت میں "یقین" کے لفظ سے قیامت کو مراد لیا ہے، قرآن مجید میں ہے :-

وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ (الحجر ۹۹)

اور موت کے آنے تک اپنے رب کی عبادت کرو۔

اس نے جو معنی لکھے ہیں اس کی عربی زبان و لغت سے تردید ہوتی ہے، کسی مفسر نے بھی یہ معنی نہیں لکھے ہیں، اس لفظ سے مراد موت ہے حضرت ابن عمرؓ، حسنؒ اور قتادہ سے یہی منقول ہے موت کو یقین اس لیے کہا گیا ہے، کہ وہ یقینی ہے، ہر متنفس کو اس سے دوچار ہونا پڑے گا۔ اس کے آنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہر جاندار تک پہنچنے کے لیے رواں دواں ہے، اس لیے آیت قرآنی کا مفہوم یہ ہے کہ جب تک زندگی ہے اللہ کی عبادت میں لگے رہو۔ اس میں کوتاہی نہ ہو۔

سورۃ آل عمران کی آیت (وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ الخ) اس وقت نازل ہوئی۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کی خبر پھیل گئی، اور یہ مشہور ہو گیا کہ آپ کا قتل ہو گیا ہے، اس موقع پر منافقوں نے مسلمانوں سے یہ کہا کہ اگر محمدؐ کا قتل ہو گیا ہو تو تم اپنے پہلے دین کی طرف واپس آجاؤ، اس پر مذکورۂ بالا آیت نازل ہوئی۔

آیت اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ ...... کے معنی یہ ہیں کہ شرک کے علمبرداروں نے دنیوی حرص و حسد کی وجہ سے اگرچہ واضح دلیلوں کی طرف توجہ نہیں کی، لیکن اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم! آپ اس بات پر فکرمند نہ ہوں، کیونکہ آپ کا بھی انتقال ہوگا۔ اور ان پر بھی موت آئے گی، پھر قیامت کے دن سب کو یکجا کیا جائے گا، جہاں اللہ کی بارگاہ میں پیشی ہوگی، اور وہ فیصلہ کرے گا۔ تب باطل کے درمیان حق کا چہرہ نمایاں ہو جائے گا۔ ان دونوں آیتوں سے کسی ترمیم یا صورت حال میں تبدیلی یا کسی نئے مفہوم کے اضافہ کا مسئلہ پیدا نہیں ہوتا ہے کہ جس کی وجہ سے

بے سروپا اندیشوں اور بے بنیاد اندازوں کی بنا پر یہ کہا جا سکے کہ حضرت ابوبکرؓ نے ان دونوں آیتوں کو اپنی طرف سے شامل کر دیا ہے، قرآن مجید میں قیامت کی ہولناکیوں کا جو تذکرہ ہے اس میں قیامت کے روز پیش آنے والے واقعات کی ایسی منظرکشی کی گئی ہے، جس سے قرآن کے حسن بیان اور اس کے معجزانہ اسلوب کی جلوہ گری ہوتی ہے، یہ اسلوب خاص طور پر مکی سورتوں میں اختیار کیا گیا ہے، جن میں مشرکین کو آگاہی دی گئی ہے، اور سرکشوں کو اس دن سے ڈرایا گیا ہے جو گویا ان ہی کے انتظار میں ہے، اور جس کو دیکھ کر خوف اور دہشت کی وجہ سے جوانوں پر بھی بڑھاپا طاری ہو جائے گا۔

يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ وَاُمِّهٖ وَاَبِيْهِ وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِيْهِ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَاْنٌ يُّغْنِيْهِ (عبس ۳۴-۳۷)

جس دن (یوم مذکورہ) آدمی اپنے بھائی سے اور اپنی ماں سے اور اپنے باپ سے اور اپنی بیوی سے اور اپنی اولاد سے بھاگے گا، ان میں ہر شخص کو اپنا ہی کام ہوگا جو اسے دوسری طرف متوجہ نہ ہونے دیگا۔

قرآن کا ایک خاص اسلوب یہ ہے کہ وہ دنیا کے بارے میں اس طرح گفتگو کرتا ہے، گویا کہ وہ گزر چکی ہو، اور آخرت کی منظرکشی اس انداز میں کرتا ہے گویا وہ زمانہ حال کی چیز ہے، اور اس کے مناظر نگاہوں کے سامنے سے گزر رہے ہیں، اس اسلوب بیان سے دل و دماغ پر نہایت ہی گہرا اثر پڑتا ہے۔ مثلاً درج ذیل آیتیں :-

وَسِيْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا اِلٰى جَهَنَّمَ زُمَرًا حَتّٰى اِذَا جَاءُوْهَا فُتِحَتْ اَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا

اور جو کافر ہیں وہ جہنم کی طرف گروہ گروہ بنا کر ہانکے جائیں گے یہاں تک کہ جب دوزخ کے پاس پہنچیں گے تو اس وقت

أَلَمْ يَأْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنكُمْ يَتْلُونَ عَلَيْكُمْ آيَاتِ رَبِّكُمْ وَيُنذِرُونَكُمْ لِقَاءَ يَوْمِكُمْ هَٰذَا ۚ قَالُوا بَلَىٰ وَلَٰكِنْ حَقَّتْ كَلِمَةُ الْعَذَابِ عَلَى الْكَافِرِينَ۔

(الزمر - ۷۱)

اس کے دروازے کھول دیے جائیں گے اور ان سے دوزخ کے محافظ کہیں گے کہ کیا تم لوگوں کے پاس تم ہی لوگوں میں سے پیغمبر نہیں آئے تھے، جو تم کو تمہارے رب کی آیتیں پڑھ کر سنایا کرتے تھے اور تم کو اس دن کے پیش آنے سے ڈرایا کرتے تھے کافر کہیں گے کہ ہاں لیکن عذاب کا حکم کافروں پر پورا ہو کر رہا۔

قرآن دنیا و آخرت کو اس طرح پیش کرتا ہے گویا کہ وہ ہمارے سامنے موجود ہیں، کبھی گفتگو کا انداز اختیار کرتا ہے۔ تو کہیں بیان واقعہ کا۔ اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ واقعات پیش آتے جارہے ہیں، اور دونوں کی مناسبت سے موقع و محل کے مطابق اللہ تعالےٰ اپنے احکام جاری فرماتا جاتا ہے، قرآن میں ہر موقع کی مثالیں موجود ہیں جن کو استاد سید قطب کی کتاب مشاہد القیامۃ فی القرآن میں تفصیل سے دیکھا جاسکتا ہے۔[1]

قرآن کے معجزانہ اسلوب، اس کی منظر نگاری اور واقعات کی سچی تصویر میں جو فنی حسن اور غیر معمولی اثر ہے، کازانوفا اس کے ادراک سے عاجز ہے، قرآن میں ایک جگہ یہ کہا گیا ہے کہ

إِنَّهُمْ يَرَوْنَهُ بَعِيدًا وَنَرَاهُ قَرِيبًا يَوْمَ تَكُونُ السَّمَاءُ كَالْمُهْلِ وَتَكُونُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ وَلَا يَسْأَلُ حَمِيمٌ حَمِيمًا يُبَصَّرُونَهُمْ

یہ لوگ اس دن کو دور سمجھتے ہیں اور ہم اس کو قریب جانتے ہیں، وہ عذاب اس دن آئے گا جب کہ آسمان پگھلے کی طرح ہو جائے گا، اور پہاڑ دھنے ہوئے

[1] مشاہد القیامۃ فی القرآن۔ ص ۴۰ - ۴۱ -

يَوَدُّ الْمُجْرِمُ لَوْ يَفْتَدِي مِنْ عَذَابِ يَوْمِئِذٍ بِبَنِيهِ وَصَاحِبَتِهِ وَأَخِيهِ وَفَصِيلَتِهِ الَّتِي تُؤْوِيهِ وَمَن فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ثُمَّ يُنجِيهِ

(المعارج ۶-۱۴)

رنگین اون کی طرح ہو جائیں گے اور کوئی دوست کسی دوست کو نہ پوچھے گا، جب کہ وہ ایک دوسرے کو دکھا بھی دیئے جائیں گے اس دن مجرم اس بات کی تمنا کریگا کہ اس دن کے عذاب سے چھوٹنے کے لیے اپنے بیٹوں کو بیوی کو بھائی کو اور کنبہ کو جن میں وہ رہتا تھا، اور تمام اہل زمین کو اپنے فدیہ میں دیدے پھر یہ فدیہ اس کو (عذاب سے) بچالے۔

کازانوفا نے مذکورہ بالا آیتوں سے جو نتیجہ نکالا ہے وہ دراصل خود اس کی عقل کی پیداوار ہے، اس کے خیال میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قیامت کے دن کو اپنی بعثت سے وابستہ سمجھتے تھے، جب کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے آثار قیامت کی بھی اپنی احادیث میں کثرت سے خبر دی ہے، مثلاً مہدی کا ظہور، دجال کا خروج، حضرت عیسیٰ کی دوبارہ آمد، یاجوج ماجوج کا خروج دابۃ الارض کا نکلنا، اور مغرب سے سورج کا طلوع وغیرہ، ان احادیث کے سرسری مطالعہ ہی سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا قیامت کے بارہ میں وہ خیال نہیں تھا، جو کازانوفا نے بیان کیا ہے، بلاشیر کو بھی اس بات کا احساس ہے کہ کازانوفا اپنے حق میں مضبوط دلیلیں پیش نہیں کرسکا جس کی وجہ سے اسے مسلمان محققین کی حمایت حاصل نہیں ہوئی اس کے برخلاف یہ حقیقت زیادہ واضح ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں اگرچہ قیامت اور جنت و دوزخ کا زیادہ تذکرہ کیا ہے، لیکن مدینہ میں مسلمانوں کی حالت جب زیادہ مستحکم ہوگئی تو آپ نے عبادات

معاملات اور مسلمانوں اور غیر مسلموں کے باہمی تعلقات کی تنظیم نو کی دعوت دی، جزیرۃ العرب میں اشاعت اسلام کی وجہ سے بھی مسلمانوں پر یہ ذمہ داری عائد ہو گئی تھی کہ وہ آخرت کے بارہ میں غور و فکر کرنے کے ساتھ ہی دنیوی زندگی کی طرف بھی توجہ کریں، لیکن یہ واقعہ ہے کہ جو آدمی آخرت کے لیے فکرمند ہوگا۔ اس کی فکر کا دائرہ حال (دنیا) ہی تک محدود نہیں ہوگا۔

بلاشیر نے اپنی کتاب "القرآن" میں شعوری یا غیر شعوری طور پر کازانوفا کی ہمنوائی کی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ

"نئے نبی کے پہلے ہی تجربہ سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ نذار الٰہی کا ان پر بڑا اثر رہا، ان کے تخیل پر زمینی حادثہ (قیامت) کا تصور غالب تھا، دنیا کے خاتمہ اور آخری محاسبہ کا تصور، اور یہ احساس کہ قیامت کا زمانہ بہت زیادہ قریب ہے اور انسانوں پر اس کے آنے کا کوئی وقت مقرر نہیں، بس ایک زبردست دھماکہ ہوگا جو گنہگاروں کو اپنی گرفت میں لے لیگا۔"

بلاشیر کے یہ خیالات کازانوفا کے ماخوذ ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ یہ مستشرقین مقام نبوت سے بے خبر ہیں، وہ قرآن کو بھی دوسری آسمانی کتابوں کی طرح انسانی دستاویز قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ یہ درست نہیں، بائبل کی کتابت حضرت موسیٰؑ و حضرت عیسیٰؑ کے دور میں نہیں ہوئی، انجیل کو حضرت عیسیٰؑ کے بعد حواریوں نے لکھا تھا اسی لیے مستشرقین ان کتابوں پر نقد و تبصرہ کرتے رہتے ہیں، لیکن قرآن اپنے لفظ و معنی کے لحاظ سے کلام الٰہی ہے اس کا متکلم اللہ ہے۔ .... جب کہ بائبل کے صرف ترجمے پائے جاتے ہیں اور اسی پر وہ قرآن کو بھی نعوذ باللہ من ذلک قیاس کرتے ہیں، اور یہی سبب ہے کہ وہ ظنون و اوہام کی وادیوں میں بھٹکتے رہتے ہیں۔

(باقی)

سیرۃ النبیؐ جلد سوم

پر

کچھ اعتراضات اور ان کے جوابات

از ضیاء الدین اصلاحی

(۲)

سید صاحب نبوت کے اصل آثار و علامات کی اہمیت واضح کرنے کے لئے متعدد مثالیں بھی پیش کرتے ہیں۔ اور لکھتے ہیں کہ

"گو پیغمبر کا اصلی معجزہ اور اس کے منجانب اللہ ہونے کی کھلی نشانی خود اس کا سرتاپا وجود ہوتا ہے، دیکھنے والوں کے لئے اس کے چشم و ابرو میں اور سننے والوں کے لئے اس کے لب و لہجہ میں اور سمجھنے والوں کے لیے اس کے پیام و دعوت میں اعجاز ہوتا ہے۔ ... انبیاءؑ کے متبعین میں سے سابقین اولین اور صدیقین و صالحین نے اپنے پیغمبروں سے معجزہ طلب نہیں کیا، حضرت ہارونؑ و یوشعؑ نے حضرت موسیٰؑ کا معجزہ دیکھ کر ان کو پیغمبر نہیں تسلیم کیا تھا، حضرت عیسیٰؑ کے حواریوں نے انکا معجزہ دیکھ کر آسمانی دولت کا حصہ نہیں پایا تھا، حضرت خدیجہؓ سب سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائیں، مگر چاند کے دو ٹکڑے ہوتے ہوئے دیکھ کر نہیں، بلکہ یہ جان کر کہ آپ غریبوں کے دست و بازو ہیں، قرضداروں کی تسکین اور سہارا ہیں، مسافروں کے ملجا و ماویٰ ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ اور عثمانؓ و علیؓ اور دیگر اصحاب کبار رضی اللہ عنہم میں سے کسی ایک نے بھی آپ کی صداقت

اور راستی کی حقیقت کو ظاہری آیات و معجزات کی روشنی میں تلاش نہیں کیا، ان کے لئے آپ کا سرتاپا وجود، نفس دعوت حق اور پیام اخلاص ہی معجزہ تھا۔ انھوں نے اس کو دیکھا اور اسی سے ایمان کی دولت پائی، مگر نمرود و فرعون اور ابوجہل و ابولہب جو آتش خلیلؑ، طوفان نیل، قحط مکہ اور انشقاق قمر کے معجزوں کے طالب تھے۔ پھر بھی ایمان کی دولت عظمیٰ سے محروم رہے۔" (سیرۃ النبیؐ جلد سوم۔ ص ۵۰۰)

سید صاحبؒ مزید واقعات کی روشنی میں بتاتے ہیں کہ عہد نبویؐ میں جو لوگ اہل نظر تھے وہ انہی علامات کی تلاش کرتے تھے، چنانچہ فرماتے ہیں۔

"بنی اسرائیل سے بڑھکر عرب میں علامات الٰہی کا رازداں کوئی اور نہ تھا، سیکڑوں یہودی شائقانہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے، امتحانات لئے، تجربات کئے مگر ان کا امتحان و تجربہ کیا تھا۔ یہ تھا کہ وہ آپؐ کے اخلاق کی آزمایش کرتے تھے، ان میں سے کسی نے آکر آپ سے خارق عادت معجزہ کا مطالبہ نہیں کیا کیونکہ انھیں معلوم تھا کہ یہ تماشے بظاہر اور لوگ بھی دکھا سکتے ہیں، اور یہ خوارق نبوت کی باطنی اور اندرونی علامات نہیں ہیں۔ آنے والے نبیؐ کی بشارتیں اور صفتیں توراۃ اور انجیل دونوں میں مذکور تھیں لیکن ان میں سے کسی میں بھی صاحب خوارق ہونا اور ظاہری معجزات دکھانا اس کی صفت نہیں بتائی گئی تھی، بلکہ توراۃ میں اس کے اوصاف یہ بتائے گئے تھے، کہ وہ فاران سے طلوع ہوگا، دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آئے گا، اس کے ہاتھ میں آتشیں شریعت ہوگی۔ وہ غریبوں اور مسکینوں کا مددگار ہوگا اور بدکاروں کو جنگی مرد کے مانند ہلاک کرے گا۔ وہ عبادت گذار اور خدا کے احکام کا مطیع ہوگا، مختون قوم (عرب) میں پیدا ہوگا، انجیل نے بتایا تھا۔ کہ وہ تسلی کی روح ہوگا، وہ مسیحؑ کی نامکمل تعلیم کی تکمیل کرے گا، خدا کی زبان اس کے منھ میں ہوگی، سیکڑوں یہود و نصاریٰ

آپؐ کی خدمت میں آئے اور انھوں نے آپ کی نبوت کا امتحان لیا مگر امتحان کے پرچہ میں مادی معجزات کا سوال شامل نہ تھا، بلکہ عام علمی اور مذہبی باتوں کی نسبت استفسار تھا۔ قرآن مجید میں اہل کتاب کے متعدد اعتراضات اور سوالات مذکور ہیں، مگر ان میں سے ایک میں بھی یہ نہیں کہ ہم کو اپنی نبوت کی صداقت کے ثبوت میں کوئی خارق عادت تماشا دکھاؤ بلکہ وہی سوالات کرتے تھے۔ جن کو پیغمبر کے علم و عمل یا تعلیم و تزکیہ سے تعلق تھا۔"

(سیرۃ النبیؐ جلد سوم صفحہ ۲۲۲ تا ۲۲۴)

مصنف سیرت نے قیصر روم اور ابوسفیان کا مکالمہ نقل کرکے دکھایا ہے کہ قیصر کے تمام سوالات صرف پیغمبر کے حقیقی آثار و علامات سے متعلق تھے، ان میں سے ایک سوال بھی ایسا نہ تھا، جس میں یہ مذکور ہو کہ یہ مکہ کا مدعی نبوت کوئی معجزہ بھی پیش کرتا ہے، حالانکہ اگر نبوت کی حقیقی علامت خوارق عادت ہوتے تو سب سے پہلے عیسائی قیصر کو یہی سوال پوچھنا چاہئے تھا۔

نجاشی کے دربار میں حضرت جعفرؓ کی تقریر کا حوالہ دیکر بتایا ہے کہ اس میں آپؐ کی مقدس تعلیم وہدایت کا تو ذکر ہے۔ مگر آپ کے خوارق عادت کا کوئی تذکرہ نہیں۔

کیا ان واقعات اور مثالوں سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ معنوی معجزات زیادہ اہم ہیں، مگر مولانا بدر عالم کو اس سے مغالطہ ہوگیا کہ سید صاحبؒ نے حسی و ظاہری معجزات کی اس طرح اہمیت کم کردی ہے۔ لیکن یہ صحیح نہیں ہے، سید صاحبؒ کا اصل مقصد نبوت کے اصلی آثار و علامات کی اہمیت دکھانا ہے، اس کو جس مدلل انداز میں واقعات اور مثالوں کے ذریعہ انھوں نے ثابت کیا ہے۔ اس کو غلط قرار دینے کی طرف مولانا بدر عالم کی توجہ نہیں گئی، لیکن انھوں نے یہ اعتراض کردیا کہ معنوی معجزات کی اہمیت بڑھا دینے سے ظاہری معجزات کی اہمیت کم ہوگئی، معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے سیرت کا بغور مطالعہ نہیں کیا ہے ورنہ سید صاحبؒ نے ظاہری اور حسی معجزات کی اہمیت پوری طرح تسلیم کی

چند اقتباسات ملاحظہ ہوں، ان سے ظاہر ہوگا کہ گو سید صاحبؒ نے معنوی آثار و علامات کو اہم قرار دیا ہے۔ مگر حسی معجزات کی نہ جڑ کھوکھلی کی ہے۔ اور نہ انھیں غیر اہم قرار دیکر اعجاز سے خالی بتایا ہے، اور نہ ان کے انکار و تحریف کے مرتکب ہوئے ہیں، حسی اور مادی معجزات کی اہمیت ظاہر کرتے ہوئے سید صاحبؒ رقمطراز ہیں۔

انبیاء و رسل اپنے وقت میں مبعوث ہو کر قوموں کو دعوت دیتے ہیں، قومیں ان کی تصدیق یا تکذیب کرتی ہیں، منکرین ہلاک اور مومنین کامیاب ہوتے ہیں، اس روحانی جہاد میں انبیاء و رسل سے ہمارے علم و دانش سے بالاتر اعمال صادر ہوتے ہیں، اور ان سے عجیب عجیب خوارق ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ (ص۲) نبوت کی روح اعظم اذن الٰہی سے سارے عالم جسمانی پر حکمراں ہو جاتی ہے، اور روحانی دنیا کے سنن و اصول عالم جسمانی کے قوانین پر غالب آجاتے ہیں، اس لئے وہ چشم زدن میں فرش زمین سے عرش بریں تک عروج کر جاتی ہیں، سمندر اس کی ضرب سے تھم جاتا ہے۔ چاند اس کے اشارہ سے دو ٹکڑے ہو جاتا ہے۔ اس کے ہاتھوں کی دی ہوئی چند خشک روٹیاں ایک عالم کو سیر کر دیتی ہیں۔ اس کی انگلیوں سے پانی کی نہریں بہتی ہیں۔ اس کے نفس پاک سے بیمار تندرست ہو جاتے ہیں، اور مردے جی اٹھتے ہیں، وہ تنہا مٹھی بھر خاک سے پوری فوج کو تہہ و بالا کر دیتا ہے، کوہ و صحرا، بحر و بر، جاندار و بے جان بحکم الٰہی اس کے آگے سرنگوں ہو جاتے ہیں۔ (ص۳)

سید صاحبؒ کے نزدیک حقیقت شناس مومنین صادقین کے لیے اگرچہ مادی معجزہ کی ضرورت نہیں ہوتی اور معاندین معجزہ طلب کرنے کے باوجود بھی ایمان کی دولت سے محروم رہتے ہیں تاہم قدرت الٰہی آخری حجت کے طور پر ان کے سامنے معجزات اور خوارق عادات بھی پیش کر دیتی ہے، علاوہ ازیں ان دونوں کے درمیان ایک اور طبقہ بھی ہوتا ہے جس کے لیے معجزات

و خوارق کی ضرورت و اہمیت مسلّم ہے مصنفؒ سیرت لکھتے ہیں۔

"جو لوگ احساس حقیقت میں فروتر ہوتے ہیں، ان کو اس سے (نبی کے معجزانہ پیام و دعوت سے) تسکین نہیں ہوتی اور وہ مادی اور محسوس نشانیوں کے طلب گار ہوتے ہیں۔ جو بالآخر ان کو دی جاتی ہیں۔" (ص۴) ایک درمیانی طبقہ بھی دنیا میں موجود رہا ہے جس کی بصیرت کے آئینہ پر غفلت کے زنگ کی کچھ چھائیاں پڑی ہوتی ہیں جب حقیقت کا آفتاب طلوع ہوتا ہے، اور اس کی معجزانہ کرنیں ان آئینوں پر پڑتی ہیں تو وہ چمک اٹھتے ہیں، اور اٰمَنَّا بِرَبِّ هٰرُوْنَ وَمُوْسٰى (طٰہٰ - ۳) پکار اٹھتے ہیں۔ فرعون کے ساحروں نے حضرت موسیٰؑ کے معجزہ کو دیکھا تو موسیٰ و ہارون کے خدا کے آگے سجدہ میں گر پڑے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی فتح روم کی پیشین گوئی پوری ہوئی، تو قریش کے نیک طبع لوگوں کی چشم باطن کھل گئی۔ اور حقیقت کا پیکر ان کے سامنے جلوہ نما ہو گیا، یہی طبقہ ہے۔ جس کو معجزات کی ظاہری نشانیوں سے بقدر استعداد حصہ پہنچتا ہے۔" (ص۵)

مادی اور حسی معجزات کی اہمیت سید صاحبؒ کے نزدیک اس لحاظ سے بھی ہے کہ

"اس کے علاوہ معجزات کا بڑا حصہ مویدات یعنی تائید حق کے لیے غیر منتظر اور غیر متوقع حالات کا رونما ہونا ہے، مومنین صادقین کو مشکلات کے عالم اور اضطراب کی گھڑیوں میں ان کے ذریعہ سے تسکین دی جاتی ہے، اور رسوخ ایمان اور ثبات قدم مرحمت ہوتا ہے، ان کی بے سروسامانیوں اور بے نوائیوں کی مکافات کی جاتی ہے اور اس سے ان کی دولت ایمانی کا سرمایہ ترقی کرتا ہے۔" (ص۶)

"اپنا مقدس فرض ادا کرنے میں اگرچہ کبھی کبھی انبیاء علیہم السّلام کو مادی آلات سے بھی کام لینا پڑتا ہے۔ لیکن وہ لوگ اکثر اپنی روحانی طاقت سے اس مقصد میں کامیا

ہوتے ہیں۔ اور مادی آلات کے استعمال میں بھی ان کے جسمانی دست و بازو سے زیادہ ان کے روحانی دست بازو کام کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے انبیاء علیہم السلام کے واقعات زندگی میں ان دلائل و آیات کو نہایت اہمیت دی ہے۔" (صفحہ ۸)

آپ کے اخلاق و عادات معجزہ تھے۔ آپؐ کی شریعت معجزہ تھی، آپ پر جو کتاب نازل ہوئی اس سے بڑا کوئی معجزہ نہیں ہو سکتا تھا، ان کے علاوہ آپؐ کی روحانی طاقت نے جسم و روح دونوں کی کائنات میں بہت کچھ اثر ڈالا، اس نے کبھی طوبیٰ کے سایہ میں آپ کے لیے بستر لگایا، کبھی سدرۃ المنتہیٰ کے حدود میں رفرف کی سواری کھڑی کی، کبھی ماکذب الفواد کے نور سے قلب مبارک کو منور کیا، اور کبھی مازاغ البصر کے سرمہ سے آپ کی آنکھوں کو روشن کیا، کبھی نزول رحمت الٰہی کے لیے آسمان کے دروازے کھولے، کبھی وادی حق کے پیاسوں کے لیے زمین کی تہہ سے پانی کے چشمے ابالے کبھی سنگ خارا کے شراروں کی روشنی میں قیصر و کسریٰ کے خزانے دکھائے، کبھی انبیائے سابقین علیہم السّلام کی زبان الہام سے اپنی کامیابی کے نغمہ ہائے بشارت سنائے۔ اور آئندہ دنیا کے واقعات غیب بتاکر، رہروان عالم کو منزل حقیقت کے نشان دکھائے۔" (صفحہ ۹) جہاد کے میدان میں آپؐ کو جو فتوحات عظیمہ حاصل ہوئیں۔ ان میں انسانوں کے لشکر اور سپاہیوں کے تیغ و خنجر سے زیادہ فرشتوں کے پرے دعاؤں کے تیر، توکل علی اللہ کے سپر، اعتماد علی الحق کی تلوار کام کرتی نظر آتی تھی، آپ کی زندگی کا سب سے بڑا فرض اسلام کی اشاعت ہے، اور روئے انور نے، نگاہ کیمیا اثر نے، تقریر دلپذیر نے اخلاق اعجاز نما نے آیات و دلائل بن کر بہت سے لوگوں کو مشرف بہ اسلام کیا ہے، غرض آپؐ کی پیغمبرانہ زندگی کے ہر منظر میں یہ براہین، یہ آیات، یہ معجزات، اسباب ظاہری کے پہلو بہ پہلو اسباب حقیقی بن کر رونما

ہوتے رہے ہیں" (صفحہ ۱۰)

معنوی معجزات کی اہمیت بیان کرتے ہوئے وہ ظاہری و حسی معجزات کی اہمیت بھی بیان کرتے ہیں۔ اور انہیں انبیاء کے سوانح کا جزء ثابت کرتے ہیں۔

لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ انبیاء ظاہری آیات اور مادی نشانات سے خالی ہوتے ہیں، تمام انبیائے کرام کی سیرتیں بیک زبان اس کی تصدیق کرتی ہیں کہ باطنی ایجو کے ساتھ ان کو ظاہری حصہ بھی ملتا ہے، قرآن مجید نے اکثر انبیاء کے سوانح و واقعات کے ضمن میں ان کے ظاہری آثار و دلائل کو بھی بہ تفصیل بیان کیا ہے۔" (صفحہ ۲۳۲)

ایک اور بحث کے ضمن میں سید صاحبؒ ارشاد فرماتے ہیں۔

" انبیاء کے بعض معجزات کا اثر صرف علم و یقین پر پڑتا ہے۔ ان سے کوئی عملی نتیجہ مترتب نہیں ہوتا، ہاتھ کا چمک اٹھنا، عصا کا سانپ بنجانا، چاند کا شق ہو جانا، اگرچہ نہایت عظیم الشان معجزے ہیں، لیکن اس کا نتیجہ صرف اس قدر ہے کہ ایک گروہ ایمان لایا، اور دوسرے نے انکار کیا۔ لیکن انبیاؑ کے بہت سے معجزات ایسے ہوتے ہیں، جن سے نہایت عظیم الشان عملی نتائج ظاہر ہوتے ہیں۔ مثلاً عصا کے سانپ بن جانے سے بنو اسرائیل کو کوئی عملی فائدہ نہ پہنچ سکا، لیکن اس کے ذریعہ سے پانی کا جو چشمہ ابلا وہ ان کے لئے حیات بخش ثابت ہوا، پہلی قسم کے معجزات کو قرآن میں حجت، برہان اور سلطان کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ کہ ان سے علم و یقین کو ترقی ہوتی ہے، اور دوسری قسم کے معجزات کو اس نے تائید اور نصر الٰہی کہا ہے، پہلی قسم کے معجزات طلب اور سوال کے محتاج ہوتے ہیں، لیکن تائید اور نصر الٰہی اس کی پابند نہیں ہوتی۔"

آغاز نبوت میں چونکہ انبیاء صرف عقائد کی تعلیم دیتے ہیں۔ اور کفار کی طرف سے

ان ہی عقائد کا انکار کیا جاتا ہے، اور ان ہی کے اثبات پر دلیل طلب کی جاتی ہے، اس لیے اول اول انبیاء سے اسی قسم کے معجزات کا ظہور ہوتا ہے، جن کا اثر صرف علم و یقین پر پڑ سکتا ہے، یہی وجہ ہے کہ خداوند تعالےٰ نے حضرت موسیٰؑ کو اسی قسم کے دو معجزے دیکر فرعون کے پاس بھیجا اور اسی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کفار قریش کو معجزۂ شق القمر دکھایا، لیکن اس کے بعد انبیاء کی تعلیم و ہدایت سے مومنین مخلصین کا ایک گروہ پیدا ہو جاتا ہے جو عموماً مفلوک الحال، خانہ بدوش، بے سرو سامان اور بے یار و مددگار ہوتا ہے، یہ گروہ اگرچہ صفائے باطن، خلوص نیت اور شدت ایمان کی بنا پر کسی معجزہ کا خواستگار نہیں ہوتا، تاہم تائید الٰہی خود اس کی طلب گار ہوتی ہے۔ اور ہر موقع پر اس کی حفاظت و حمایت کرتی ہے، یہی وجہ ہے کہ تائیدات الٰہیہ کا ظہور اکثر بغیر طلب و سوال کے ہوتا ہے، مسلمانوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی معجزہ کا سوال نہیں کیا، لیکن آپ سے اکثر معجزات کا ظہور ان ہی کے درمیان ہوا، بالخصوص غزوات میں اکثر تائید الٰہی نے مسلمانوں کی کی ہے، غزوۂ بدر و حنین میں فرشتوں کا آسمان سے نازل ہونا، تھوڑے سے زاد راہ کا تمام فوج کے لیے کافی ہونا، آپ کی انگلیوں سے پانی کا نکلنا، یہ اور اس قسم کے بہت سے معجزات، غزوات ہی کے زمانہ میں آپ سے ظہور پذیر ہوئے۔ اور ان سے تمام مسلمانوں نے ایسی حالت میں فائدہ اٹھایا۔ جب کہ تمام دنیوی اسباب و وسائل منقطع ہو چکے تھے۔

(سیرۃ النبی جلد ۳۔ صـ ۲۹۶)

غرض سید صاحبؒ کے نزدیک مادی نشانات کی اہمیت مسلم ہے۔ اور وہ ان کے بارے میں کسی شک و شبہ میں مبتلا نہ تھے۔ معجزۂ شق القمر کے بارے میں فرماتے ہیں۔

"ہدایت کی ان نشانیوں میں کفار مکہ کے لئے سب سے آخری اور فیصلہ کن نشان

شق قمر تھا، جس کے بعد آیات ہلاکت کا آغاز ہونے والا تھا، احادیث میں ہے کہ کفار مکہ آپ سے معجزہ کے طالب تھے تو آپؐ نے ان کو شق قمر کا معجزہ دکھایا، چاند دو ٹکڑے ہو کر نظر آیا۔" (سیرۃ النبیؐ جلد سوم۔ صـ ۲۹۵)

اوپر کے اقتباس کو ملاحظہ کرنے کے بعد ناظرین خود فیصلہ کریں کہ کیا معترض نے جو یہ اعتراض کیا ہے کہ سید صاحبؒ نے معجزے کی اہمیت گرائی اور اس کی جبہ کو کھلی اور اعجاز کا انکار کیا ہے وہ کس حد تک صحیح ہے۔

سیرۃ النبیؐ اور معجزات کی تقلیل | مولانا بدر عالم صاحب کا خیال ہے کہ سیرۃ النبیؐ میں معجزات کی تعداد کم سے کم بتائی گئی ہے، لکھتے ہیں:۔

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات سے ذوق نہ رکھنے والے اصحاب پر یہ عدد (ایک ہزار سے تین ہزار تک) بھی گراں ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ آپ کے معجزات میں صرف آپ کے اخلاق و شمائل ہی کا ایک باب نظر آئے۔ اور دوسرے عجائبات جو ہر نبی کی زندگی میں ثابت ہوتے ہیں وہ یہاں سے قلم زد کر دیے جائیں ورنہ کم از کم ان کو پھیکا ضرور کر دیا جائے انا للہ (ترجمان السنہ۔ جلد چہارم۔ صـ ۶۰) افسوس ہے۔ کہ آج مذکورۂ بالا عدد بھی ہماری نظروں میں کھٹکتا ہے۔ اور خرق عادت کا تو سر پر اس طرح سوار ہے کہ مستند سے مستند معجزات میں بھی ہمارا قلم کتر بیونت کی مقراض لگائے بغیر نہیں رکتا۔ (صـ ۶۰) معجزات کی تعداد و شمار پر حیرت کرنے والوں نے ایک طرف تو معجزات کا مفہوم ہی اپنے ذہنوں میں بہت محدود قرار دے لیا ہے، دوسری طرف اکثر اخبار غیب کو اس فہرست سے عمداً یا سہواً خارج سمجھ لیا ہے۔" (صـ ۶۲)

معجزات کو محدود اور ان کی تعداد کو کم کرنے کا اعتراض سید صاحبؒ کی ان تحریروں کی وجہ سے

عائد کیا گیا ہے۔

"کتب دلائل کے ان مصنفین کا مقصد معجزات کی صحیح روایات کو یکجا کرنا نہیں بلکہ کثرت سے عجیب و حیرت انگیز واقعات کا مواد فراہم کرنا تھا۔ تاکہ خاتم المرسلین کی فضائل و مناقب کے ابواب میں معتد بہ اضافہ ہو سکے۔ (سیرۃ النبی جلد سوم ص۲۱) یا یوں کہو کہ عشق نبویؐ نے فضائل و مناقب کی کثرت کے شوق میں ہر قسم کی روایتوں کے قبول کرنے پر ان کو آمادہ کر دیا۔" (ص ۲۴) "مسلمانوں کے نزدیک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم افضل الانبیا ہیں۔ آپ کامل ترین شریعت لے کر مبعوث ہوئے ہیں، آپ تمام محاسن کے جامع ہیں، یہ اعتقاد بالکل صحیح ہے، لیکن اس کو لوگوں نے غلط طور پر وسعت دیدی اور انبیائے سابقین کے تمام معجزات کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں جمع کر دیا اور اس اعتقاد کی بدولت تمام مسلمانوں میں پھیل گئے۔ بیہقی اور ابونعیم نے دلائل میں اور سیوطی نے خصائص میں علانیہ دوسرے انبیا کے معجزات کے مقابل میں ان ہی کے مثل آپ کے معجزات بھی ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالے ہیں۔ اور ثابت کرنا چاہا ہے کہ جس طرح آپؐ کی تعلیم تمام انبیا کی تعلیمات کا عطر، خلاصہ اور مجموعہ ہے۔ اسی طرح آپؐ کے معجزات بھی تمام دیگر انبیاء کے معجزات کا مجموعہ ہے، اور جو کچھ عام انبیا سے متفرق طور پر صادر ہوا وہ تمام کا تمام مجموعاً آپ سے صادر ہوا۔ ظاہر ہے کہ اس مماثلت اور مقابلہ کے لئے تمام تر صحیح روایتیں دستیاب نہیں ہو سکتیں۔ اس لیے لوگوں نے ان ہی ضعیف اور موضوع روایتوں کے دامن میں پناہ لی۔ کہیں شاعرانہ تخیل کی بلند پروازی اور نکتہ آفرینی سے کام لیا۔" (سیرۃ النبی جلد سوم۔ صفحہ ۳۰، ۳۱)

سید صاحبؒ دوسرے انبیاء کے معجزات سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات کی

مماثلت و مقابلہ کی متعدد مثالیں پیش کرنے کے بعد ارشاد فرماتے ہیں۔

"قرآن مجید اور احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ انبیاءؑ کے گذشتہ صحیفوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کی پیشین گوئیاں ہیں۔ اور ان کے مطابق یہود و نصاری کو ایک آنے والے پیغمبر کا انتظار تھا، اس واقعہ کو دروغگو راویوں نے یہاں تک وسعت دی کہ یہودیوں کو دن، تاریخ، سال، وقت اور مقام سب کچھ معلوم تھا، چنانچہ ولادت نبویؐ سے قبل علمائے یہود ان سب کا پتہ بتایا کرتے تھے۔ اور عیسائی راہبوں کو تو ایک ایک خط و خال معلوم تھا۔ بلکہ پرانے گھرانوں اور دیروں اور کنیسوں میں ایسی مخفی کتابیں موجود تھیں جن میں آپ کا تمام حلیہ لکھا تھا۔ اور اگلے لوگ ان کو بہت چھپا چھپا کر رکھتے تھے بلکہ بعض دیروں میں تو آپ کی تصویر تک موجود تھی، تورات و انجیل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بعض پیشین گوئیاں حقیقت میں موجود تھیں۔ اور وہ آج بھی ہیں، لیکن وہ استعارات و کنایات اور مجمل عبارتوں میں ہیں۔ ان کو ضعیف و موضوع روایتوں میں صاف صاف آپؐ کے نام و مقام کی تخصیص و تعیین کے ساتھ پھیلا دیا گیا (ص ۱۳۲، ۱۳۳)

سید صاحبؒ نے تکثیر معجزات کے اسباب بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

"بعض واقعات ایسے ہیں جن کو کسی حیثیت سے معجزہ نہیں کہا جا سکتا لیکن تکثیر معجزات کے شوق میں ذرا سا بھی کسی بات میں اعجوبہ پن ان کو نظر آیا تو اس کو مستقل معجزہ بنا لیا مثلاً حضرت عائشہؓ سے ایک روایت ہے اور وہ مسند امام احمد بن حنبل میں بھی مذکور ہے کہ آپ کے گھر میں کوئی پالو جانور تھا، جب آپ اندر تشریف لاتے تو وہ نہایت سکون و اطمینان کے ساتھ ایک جگہ بیٹھا رہتا تھا، جب آپؐ باہر چلے جاتے تو وہ ادھر ادھر دوڑنے لگتا تھا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حیوانات کو بھی آپ کی جلالت قدر اور حفظ مراتب کا پاس تھا۔

اور آپ کی عظمت و شان سے واقف تھے لیکن درحقیقت یہ کوئی معجزہ نہیں، بلکہ عام لوگوں سے بھی بعض جانور اسی طرح ہل مل جاتے ہیں۔" (ص ۳۵)

حضرت سید صاحبؒ نے اس طرح کی اور مثالیں تحریر کرنے کے بعد معجزات کی تعداد بڑھانے کی ایک وجہ یہ بھی لکھی ہے۔

"معجزات کی تعداد بڑھانے کے شوق میں کتب دلائل کے مصنفین نے یہ بھی کیا ہے کہ ایک ہی واقعہ کی روایت میں اگر مختلف سلسلہ سند کے راویوں میں باہم موقع، مقام یا کسی اور بات میں ذرا سا بھی اختلاف نظر آیا تو اس کو چند واقعہ قرار دیدیا۔ مثلاً ایک واقعہ یہ ہے کہ ایک اونٹ جو دیوانہ ہو گیا تھا۔ یا بگڑ گیا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب اس کے پاس گئے تو اس نے مطیعانہ سر ڈال دیا۔ صحابہ نے کہا یا رسول اللہؐ جب جانور آپؐ کے سامنے سر جھکاتے ہیں تو ہم کو انسان ہو کر تو ضرور آپؐ کے سامنے سر بسجود ہونا چاہئے۔ آپؐ نے فرمایا۔ "اگر میں کسی انسان کو سجدہ کرنا روا رکھتا تو بیوی کو کہتا کہ وہ شوہر کو سجدہ کرے۔" یہ ایک ہی واقعہ ہے جو ذرا ذرا سے اختلاف بیان کی بنا پر چودہ پندرہ واقعہ بن گیا ہے۔" (جلد سوم ص ۳۶)

سید صاحبؒ کی ان ہی تحریروں کی وجہ سے مولانا بدر عالم صاحب نے ان پر یہ اعتراض کیا ہے کہ انھوں نے معجزات کی تعداد کم کر دی ہے۔ لیکن سید صاحب نے معجزات کی کثرت پر نہایت قوی دلائل سے جو اعتراضات کئے ہیں۔ مولانا نے ان کی کوئی تردید نہیں فرمائی ان کو یہ تو بتانا ہی چاہئے تھا کہ یہ اعتراضات صحیح ہیں یا غلط۔

معجزات کی کثرت پر اعتراضات سے یہ نتیجہ نکالنا کسی طرح صحیح نہیں ہے کہ سیرت کے مصنف پر خرق عادات کا ہوا سوار ہے۔ اس لئے مستند سے مستند معجزات میں بھی ان کا قلم

کتر بیونت کی مقراض لگائے بغیر نہیں رہا۔ اور انھوں نے معجزات کی تعداد محدود اور قلیل کر دی۔

خوارق و معجزات کے باب میں سیرۃ النبیؐ کا جو موقف و نظریہ پہلے تفصیل سے بیان کیا جا چکا ہے، اس سے صاف ظاہر ہے کہ سید صاحب پر نہ خرق عادت کا ہوا سوار تھا۔ اور نہ انھوں نے مستند روایات سے ثابت معجزات کا انکار کیا ہے، ان کا سارا اعتراض ضعیف و موضوع روایات میں مذکور معجزات پر ہے۔ اگر معترض کے طعن و طنز کو نظر انداز کر کے دیکھا جائے۔ تو ان اعتراض کا حاصل صرف یہ نکلتا ہے کہ

(الف) معجزات کو صرف اخلاق و شمائل تک محدود کر دیا ہے۔

(ب) آپؐ کی زندگی کے عجائبات کو قلم زد کر دیا ہے۔

(س) اخبار غیب کو معجزات کی فہرست سے عمداً یا سہواً خارج کر دیا ہے۔

مگر ان میں سے کوئی بات بھی درست نہیں ہے، سید صاحبؒ معجزات و خوارق کو تسلیم کرتے تھے اس لئے اس کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ انھوں نے ان کو اخلاق و شمائل تک محدود کر دیا ہے اوپر اس کی تفصیل گذر چکی ہے۔ اگر ناظرین کے ذوق پر بار نہ ہو تو وہ سید صاحب کے ان الفاظ کو پھر پڑھنے کی زحمت گوارا کریں۔

" اس روحانی جہاد میں انبیاء و رسل سے ہمارے علم و دانش سے بالاتر اعمال صادر ہوتے ہیں اور ان سے عجیب عجیب خوارق ظہور پذیر ہوتے ہیں۔" (سیرۃ النبیؐ ص ۲۴ ج ۲)

" وہ وہ کچھ دیکھتے تھے، جو ہم نہیں دیکھ سکتے، وہ وہ کچھ سنتے تھے، جو ہم نہیں سن سکتے وہ وہ کچھ جانتے تھے، جو ہم نہیں جان سکتے۔ اور ان سے وہ اعمال بھی صادر ہوتے تھے۔ جو کسی اور سے نہیں ہو سکتے۔" (ص ۴) "لیکن جو لوگ احساس حقیقت میں فرو تر ہوتے ہیں۔ ان کو اس سے تسکین نہیں ہوتی اور وہ مادی اور محسوس نشانیوں کے طلبگار

ہوتے ہیں۔ جو بالآخر ان کو [illegible] ہیں" قرآن مجید نے انبیاء علیہم السلام کے واقعات زندگی میں ان دلائل و آیات کو نہایت اہمیت دی ہے" (ص۸)، "اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کو ان تمام معجزات کا مجموعہ بنا دیا۔ جو علی قدر مراتب ہر طبقہ، ہر فرقہ اور ہر گروہ کے لیے ضروری تھے۔ آپؐ کے اخلاق و عادات معجزہ تھے۔ آپؐ کی شریعت معجزہ تھی۔ آپ پر جو کتاب نازل ہوئی اس سے بڑا کوئی معجزہ نہیں ہو سکتا تھا۔ ان کے علاوہ آپ کی روحانی طاقت نے جسم و روح دونوں کی کائنات میں بہت کچھ اثر ڈالا، اس نے کبھی طوبیٰ کے سایہ میں آپ کے لیے بستر لگایا، کبھی سدرۃ المنتہیٰ کے حدود میں رفرف کی سواری کھڑی کی۔ کبھی ماکذب الفؤاد کے نور سے قلب مبارک کو منور کیا اور کبھی مازاغ البصر کے سرمہ سے آپ کی آنکھوں کو روشن کیا، کبھی نزول رحمت کے لئے آسمان کے دروازے کھولے، کبھی وادیٔ حق کے پیاسوں کے لیے زمین کی تہ سے پانی کے چشمے ابالے، کبھی سنگ خارا کے شراروں کی روشنی میں قیصر و کسریٰ کے خزانے دکھائے، کبھی انبیائے سابقین علیہم السلام کی زبان الہام سے اپنی کامیابی کے نغمہ ہائے بشارت سنائے۔ اور آئندہ دنیا کے واقعات غیب بتا کر رہروان عالم کو منزل حقیقت کے نشان دکھائے۔ ص۹)

"تمام انبیائے کرام کی سیرتیں بیک زبان اس کی تصدیق کرتی ہیں کہ باطنی آیتوں کے ساتھ ان کو ظاہری حصہ بھی ملتا ہے، قرآن مجید نے اکثر انبیاء کے سوانح و واقعات کے ضمن میں ان کے ظاہری آثار و دلائل کو بھی بہ تفصیل بیان کیا ہے" (ص ۲۲۲)

یہ اور اسی قسم کے دوسرے اقتباسات اوپر گذر چکے ہیں۔ جن سے نہایت قطعی طور پر ثابت ہوتا ہے کہ سیرۃ النبیؐ کے مصنف کے نزدیک حسی معجزات کی بھی اہمیت ہے، اور انھوں نے آپؐ کے معجزات کو صرف اخلاق و شمائل تک محدود نہیں کیا ہے۔ اگر کوئی یہ سمجھتا ہے تو سمجھے۔ مگر اس کے سمجھنے سے حقائق

نہیں بدل سکتے۔

عجائبات کو قلم زد کرنے کی بات بھی صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ قرآن و احادیث صحیحہ سے ثابت جو معجزات سیرۃ النبیؐ میں مذکور ہیں کیا وہ عجائب سے خالی ہیں۔ اگر نہیں خالی ہیں تو یہ کہنا کہاں تک درست ہوگا کہ اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے عجائب کو قلم زد کر دیا گیا ہے، ناظرین اس موقع پر سیرۃ النبیؐ جلد سوم کے مباحث و مندرجات پر ایک نظر ڈال لیں تو ان کو خود اندازہ ہوگا۔ کہ یہ اعتراض صحیح نہیں ہے۔ اس مقصد سے ہم اس کے مشمولات کا یہاں مختصر جائزہ پیش کرتے ہیں:۔

سیرت میں آیات و دلائل نبوی کی تفصیل کے زیر عنوان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مافوق فہم بشری سوانح و واقعات کی تفصیل قلمبند کی گئی ہے، جو دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصہ میں نبوت کے لوازم و خصائص کا ذکر ہے۔ اور اس میں مندرجہ ذیل امور کا تذکرہ ہے، وحی، نزول ملائکہ (آپ کی خدمت میں حضرت جبرئیل و میکائیل اور دوسرے فرشتوں کا آنا) عالم رویا (اس میں پہلے آپ کے رویائے تمثیلی کا مفصل ذکر ہے۔ پھر مشاہدات و مسموعات کے زیر عنوان، عالم بیداری، اسرا یا معراج اور شق صدر یا شرح صدر کے زیر عنوان جو کچھ لکھا گیا ہے کیا وہ عجائبات سے خالی ہے؟ اگر نہیں تو پھر یہ اعتراض کیسے درست ہو سکتا ہے کہ سیرۃ النبیؐ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عجائبات کو قلم زد کر دیا گیا ہے۔

خصائص و لوازم نبوت کے بعد قرآن مجید میں مذکور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دلائل و معجزات کو ان تین حصوں میں بیان کیا ہے، (۱) کفار کی ہدایت و دعوت اور مسلمانوں کی مزید ایمانی تسلی کے لیے معجزانہ نشانیاں (۲) مصیبتوں کی گھڑیوں میں تائیدات غیبی کا ظہور، (۳) وہ پیشین گوئیاں جن کا لفظ لفظ صداقت کے معیار پر صحیح اترا۔

مصنف سیرت نے سب سے پہلے معجزہ قرآن کا ذکر کیا ہے۔ اس میں قرآن کے اعجاز کا ذکر جس طور پر کیا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ نہ تو وہ خرق عادت کی تردید کرتے ہیں۔ اور نہ انھوں نے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے عجائب کو قلمزد کرنا پسند کیا ہے۔ اس میں آپؐ کی امیت، آپؐ کی حفاظت وعصمت اور دشمنوں کے مقابلہ میں آپؐ کی منجانب اللہ نگہبانی ونگرانی، لیلۃ الجن (آپؐ کے پاس جنوں کے آنے اور مشرف بہ اسلام ہونے)، شق قمر اور آخر میں غلبہ روم کی پیشین گوئی کا ذکر ہے۔ یہ سارے مباحث عجائب وخوارق کا مجموعہ ہیں جن کو سید صاحب نے قلم بند کیا ہے۔ پھر مولانا بدر عالم صاحب نے یہ کیسے اعتراض کر دیا کہ انھوں نے عجائب کو قلمزد کر دیا ہے۔

اس کے بعد قرآن مجید میں مذکور ان عجائب کا تذکرہ ہے۔ طیر ابابیل کی نشانی، شہب ثاقب کی کثرت، شرح صدر، مکہ سے بیت المقدس تک ایک شب میں سفر، قریش پر قحط سالی کا عذاب، موقع ہجرت کی نشانیاں، خواب میں کفار کا کم دیکھنا، مسلمانوں کا کافروں کی نظر میں اور کافروں کا مسلمانوں کی نظر میں کم کر کے دکھانا، پھر کافروں کی آنکھوں میں مسلمانوں کا دونا نظر آنا۔ فرشتوں کی آمد، میدان جنگ میں پانی برسانا، لڑائیوں میں نیند کا طاری ہونا، کنکری پھینکنا، غزوہ بدر میں دو میں سے ایک کا وعدہ، غزوہ احزاب کی خبر، غزوہ احزاب میں آندھی، غزوہ حنین میں نصرت، غیب پر اطلاع، بنو نضیر کی سازش، مہاجرین حبش کو بشارت، ہجرت کے بعد قریش کو مہلت نہ ملے گی مدینہ میں بڑے بڑے مصائب کا سامنا ہوگا، دینی ودنیاوی شہنشاہی کا وعدہ، قبائل عرب کو شکست ہوگی، قریش کی شکست اور بربادی کے وعدے، فتح کی پیشین گوئیاں، خیبر اور حنین کی پیشین گوئی، یہود کو اعلان، روم کی قوت ٹوٹ جائیگی، خلفائے راشدین کے زمانہ کی لڑائیاں، وفات نبویؐ کی پیشین گوئی۔

ان میں سے کوئی مبحث ایسا نہیں ہے، جو عجائب وغرائب سے خالی ہو مگر اس کے بعد بھی سیرۃ النبیؐ کی اس جلد پر اعتراض ہے کہ اس میں عجائب کو قلمزد کر دیا گیا ہے۔

صحیح اور معتبر حدیثوں سے ثابت جو آیات ودلائل نبوی سیرۃ النبیؐ کی اس جلد میں تحریر ہیں ان کی فہرست بھی ملاحظہ کیجیے اور بتائیے کہ کیا اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عجائب قلم انداز کیے گئے ہیں؟

سیرت کے اس حصہ میں مختلف ذیلی عنوانات قائم کر کے آپؐ کی زندگی کے متعدد عجائب بیان کیے گئے ہیں، پہلے عنوان "علامات نبوت قبل بعثت" کے تحت ان امور کا ذکر ہے۔

حضرت آمنہ کا خواب، ولادت نبوی کی پیشین گوئیاں یہود ونصاریٰ میں، بتخانوں میں غیبی آوازیں، شق صدر، مبارک قدم ہونا۔ بے ستری میں آپؐ کا غش کھا کر گرنا۔ نیند طاری ہونا۔ صدائے غیب۔ پتھروں سے سلام کی آواز، خواب میں فرشتوں کی آمد۔

"اشیا میں اثر" کے عنوان سے یہ خوارق بیان ہوئے ہیں۔

ستون کا رونا۔ منبر کا ہلنا۔ چٹان کا پارہ پارہ ہو جانا، درختوں اور پہاڑوں سے سلام کی آواز آنا، پہاڑ کا ہلنا۔ آپؐ کے اشارہ سے بتوں کا گر جانا۔ کھانوں سے تسبیح کی آواز۔ زمین کا ایک مرتد کو قبول نہ کرنا۔ درختوں کا چلنا۔ خوشۂ خرما کا چلنا۔ درخت کا چلنا اور اس سے آواز آنا۔ بے دودھ کی بکری کا دودھ دینا۔ سست گھوڑے کا تیز رفتار ہو جانا۔ اندھیرے میں روشنی ہونا۔ جانور کا سجدہ کرنا۔ جانور کا آپؐ کے مرتبہ کو پہچاننا۔ حافظہ بڑھ جانا۔

"شفائے امراض" کے زیر عنوان یہ معجزات درج ہیں۔

حضرت علیؓ کی آنکھوں کا اچھا ہونا۔ ٹوٹی ہوئی ٹانگ کا درست ہو جانا۔ تلوار کے زخم کا اچھا ہونا، اندھے کا اچھا ہونا۔ بلا دور ہونا۔ گونگے کا بولنا۔ مرض نسیان کا دور ہونا۔ بیمار کا تندرست ہونا، ایک جلے ہوئے بچے کا اچھا ہونا۔ جنون کا دور ہونا۔

"استجابت دعا" میں ان معجزات وخوارق کا تذکرہ ہے۔

قریش پر عذاب آنا اور اس کا دور ہونا، رؤسائے قریش کے حق میں بددعا، حضرت عمرؓ کا اسلام، سراقہ کے گھوڑے کا پاؤں دھنس جانا۔ مدینہ کی آب وہوا کے لیے دعا۔ قحط کا دور ہونا۔ اور پانی کا برسنا، حضرت انسؓ کے حق میں دعائے برکت، حضرت ابن عباسؓ کے حق میں دعائے علم، حضرت ام حرامؓ کے

حق میں دعائے شہادت۔ ایک نوجوان کی ہدایت کے لیے دعا، حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کے مستجاب الدعوات ہونے کی دعا۔ حضرت عروہؓ کے حق میں دعائے برکت۔ حضرت ابوامامہ باہلیؓ کے حق میں دعائے سلامتی۔ حضرت طلحہؓ کے حق میں برکت اولاد کی دعا، حضرت ابوہریرہؓ کی والدہ کے حق میں دعائے ہدایت، اونٹ کا تیز ہوجانا، بیماری کا اچھا ہونا۔ سواری کی قوت آجانا۔ ایک مغرور کا ہاتھ شل ہوجانا۔ قبیلۂ دوس کا مسلمان ہونا۔ رفع بے پردگی کے لئے دعا، سلطنت کسریٰ کی تباہی۔ دعائے برکت کا اثر۔ طولِ عمر کی دعا۔ ایک بچہ کی ہدایت کے لیے دعا۔

"اشیا میں اضافہ" کے عنوان کے تحت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے ان عجائب کی تفصیل قلمبند کی گئی ہے۔

تھوڑے سے کھانے میں ستر اسّی آدمیوں کا سیر ہوجانا، چھوہارے کے ڈھیر کا بڑھ جانا، کھانے میں حیرت انگیز برکت، گھی کی مقدار میں برکت، جو کی مقدار میں برکت، کھانے میں حیرت انگیز اضافہ۔ تھوڑے سے زادِ راہ میں غیر معمولی برکت، تھوڑے سے زادِ راہ میں عظیم برکت، آدھ سیر آٹے اور ایک بکری میں برکت، قلیل تعداد میں کثیر برکت، ایک پیالہ میں حیرت انگیز برکت، دودھ کے ایک پیالہ کی برکت، بکری کے دست میں برکت، بکری کے تھنوں میں برکت، تھوڑے سے کھانے میں ایک وسق جو کی برکت، توشہ دان کا ہمیشہ بھرا رہنا، تھوڑی کھجوروں میں برکت۔

"پانی جاری ہونا" میں ان عجائب و خوارق کا ذکر ہے۔

مشکیزہ سے پانی ابلنا، انگلیوں سے پانی جاری ہونا، پانی کا بڑھ جانا، انگلیوں کی برکت، انگلیوں سے پانی کا چشمہ بہنا۔ کلی سے پانی بڑھ جانا، ہاتھ منھ دھونے کی برکت، انگلیوں سے پانی کا جوش مارنا، تھوڑے پانی میں کثیر برکت، انگلیوں سے پانی ابلنا۔

اس فہرست کو نقل کرنے کا مقصد یہ دکھانا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خوارق و

معجزات کی پوری تفصیل سیرۃ النبیؐ میں موجود ہے، اس لئے یہ اعتراض کسی طرح درست نہیں ہے کہ اس میں عجائب کو قلمزد کر دیا گیا ہے یا انہیں پھیکا کر دیا گیا ہے۔ اور اخلاق و شمائل کی حد تک ہی معجزات کو محدود رکھا گیا ہے۔ معترض کی یہ بات بھی صحیح نہیں ہے کہ مستند سے مستند معجزات میں سید صاحبؒ کا قلم کتربیونت کی مقراض لگائے بغیر نہیں رہا۔ البتہ ان کے قلم کی مقراض نے ضعیف اور موضوع روایات میں مذکور معجزات میں کتربیونت ضرور کی ہے، جس کی بنا پر مولانا بدر عالم کو اس قدر برہمی ہے، اور وہ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ سیرت میں کم سے کم معجزات کا ذکر ہے، ظاہر ہے کہ حقیقت شناس لوگوں کی نظر میں ان کے اس شکوۂ بیجا کی کوئی اہمیت نہیں ہوسکتی۔

مولانا بدر عالم نے اس کی بھی شکایت کی ہے کہ معجزات کا مفہوم اپنے ذہنوں میں بہت محدود قرار دینے والوں نے اکثر اخبار غیب کو اس فہرست سے عمداً یا سہواً خارج سمجھ لیا ہے مگر یہ اعتراض بھی پہلے اعتراضات ہی کی طرح کوئی وزن نہیں رکھتا، سارا جھگڑا موضوع اور ضعیف روایات میں مذکور معجزات اور اخبار غیب کا ہے۔ سید صاحبؒ نے اپنی کتاب کا اصول یہ بنایا ہے کہ وہ روایات صحیحہ سے ثابت معجزات و خوارق ہی کو اس میں جگہ دیں گے اور معجزات کی تعداد بڑھانے کے شوق میں ضعیف و موضوع روایات میں بیان کیے گئے معجزات، عجائب اور اخبار غیب سے سیرۃ النبیؐ جیسی مستند و معیاری کتاب کو آلودہ نہ کریں گے، لیکن مولانا بدر عالم صاحب کا اصرار ہے کہ ان کو بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل و مناقب میں معتدبہ اضافہ کیلئے سیرت میں شامل کیا جانا چاہیے تھا۔ ارباب نظر خود فیصلہ کریں کہ کس کا نقطۂ نظر حق و انصاف پر مبنی اور صحیح ہے۔

سیرۃ النبیؐ جلد سوم میں اخبار غیب یا پیشین گوئی کا ایک مستقل باب قائم کیا گیا ہے، اس میں سید صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں:۔

"فطرت بشری کے عجز اور بیچارگی کا سب سے بڑا دردناک نظارہ مستقبل سے

نا واقفیت اور جہالت ہے۔ انسان کی مضطرب اور بے چین فطرت مستقبل کے بحرِ ظلمات میں ہاتھ پاؤں مارتی ہے اور تھک کر اپنی نادانی اور جہالت کا اعتراف کر لیتی ہے اور اسی لیے وہ اس بات پر مجبور ہے کہ جو انسانیت سے مافوق کسی دعویٰ کا مدعی ہو اس کی آزمایش اور امتحان کے لیے اسی بحرِ بیکراں کی شناوری کو معیار اور سند قرار دیدے، چنانچہ یہی اخبارِ غیب اور پیشین گوئی کی قدرت نبوت اور رسالت بلکہ عام بزرگی اور ولایت کے ثبوت پر نوعِ انسانی کے عام افراد کے نزدیک ایک دلیل اور حجت قائمہ ہے۔ بنی اسرائیل کے نزدیک یہ وصف نبوت کا اس درجہ لازمہ تھا کہ ان کی زبان میں پیغمبر کا نام ہی "پیشین گو" ہے، عربی عبرانی اور دوسری سامی زبانوں میں "نبی" یا "نابی" جو پیغمبر کے معنی میں مستعمل ہے اس کے لغوی معنی مخبر اور پیشین گو کے ہیں۔ اور نبوت کے معنی مخبری اور پیشین گوئی کے ہیں، اسی لیے بنی اسرائیل کے نزدیک نبی اور پیغمبر کی صرف اسیقدر حقیقت ہے کہ وہ غیب کا قاصد اور جہانِ نادیدہ کا مخبر ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے عرب کی یہ کیفیت تھی کہ تمام عرب کاہنوں کے جال میں گرفتار تھا۔ عرب کے تمام مشرکانہ معابد کاہنوں کے دار السلطنت تھے۔ جن میں بیٹھکر وہ عرب کے دل و دماغ پر حکومت کر رہے تھے۔ مشہور کاہنوں کے پاس لوگ دور دور سے سفر کر کے آتے تھے، اور ان سے مستقبل اور غیب کی باتیں دریافت کرتے تھے۔ وہ ایک خاص قسم کی مقفی اور مسجع عبارتوں میں ان کو غیب کی اور مستقبل کی باتیں بتاتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب پیغمبر بنا کر عربوں کے درمیان بھیجے گئے۔ تو ان کے لیے ثبوتِ نبوت کی سب سے بڑی دلیل یہی اخبارِ غیب اور پیشین گوئی ہو سکتی تھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیسیوں پیشین گوئیاں کیں اور مستقبل کے واقعات کی باتوں کو وحی یقین کی طرح پیش فرمایا، اور وہ سب کے سب بے کم و کاست پوری اتریں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ان پیشین گوئیوں کا صدور مختلف حالتوں میں ہوا اور

آپ کو ان کی اطلاع مختلف صورتوں میں دی گئی، مثلاً کبھی قرآن مجید کی وحی کی صورت میں، کبھی عالمِ خواب میں اور کبھی زبانِ صداقت نشان کے عام الفاظ میں جن میں طریقۂ اطلاع کا اظہار نہیں ہے، قرآن مجید کی پیشین گوئیوں کی تفصیل اس سے پہلے گذر چکی ہے خواب کی پیشین گوئیوں کا تذکرہ کچھ عالمِ رؤیا کے بیان میں آچکا ہے، باقی پیشین گوئیاں سطورِ ذیل میں تحریر ہیں۔" (سیرۃ النبیؐ ج ۳ ص ۲۸۶، ۲۸۷)

طوالت مانع نہ ہوتی تو ہم ان سب اخبارِ غیب کی فہرست درج کرتے جو تقریباً ۳۰-۳۵ صفحات میں بیان کیے گئے ہیں اور جن کی تعداد ۵۴ ہے۔

یہ بات قابلِ غور ہے کہ جب سید صاحبؒ کے نزدیک اخبارِ غیب اور پیشین گوئیوں کی اسقدر اہمیت ہے اور وہ اسے نبوت کی دلیل اور حجت قائمہ مانتے ہیں اور اسی حیثیت سے انھوں نے متعدد پیشین گوئیوں کا ذکر بھی سیرۃ النبیؐ میں کیا ہے تو کیا وہ انھیں عمداً یا سہواً معجزات کی فہرست سے خارج قرار دے سکتے تھے، ؟ اوپر جو اقتباس نقل کیا گیا ہے کیا اس کے بعد بھی یہ کہنا درست ہوگا کہ سید صاحبؒ کو معجزات کا کوئی ذوق نہ تھا۔ اور ان پر معجزات کی کثرت گراں تھی۔ اور انھوں نے صرف اخلاق و شمائل ہی تک معجزات کا دائرہ محدود کر دیا ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ ایک طبقہ کو تو یہ شکوہ ہے کہ سید صاحبؒ نے ان سب چیزوں کو بھی معجزہ قرار دیا ہے۔ جن میں ذرا سا بھی اعجوبہ پن ہے اور مولانا بدر عالم صاحب فرماتے ہیں کہ سید صاحبؒ نے عجائب پر مقراض چلادی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرت سید صاحبؒ کو نہ معجزات کی کثرت سے کوئی گھبراہٹ تھی، اور نہ انھوں نے آپ کی زندگی کے عجائب کو قلمزد اور پھیکا کیا ہے، بلکہ اپنی بالغ نظری، عالمانہ شان، روحِ دین سے واقفیت اور قرآن و حدیث کی نکتہ شناس ہونے کی بنا پر ان ہی حسی معجزات، عجائب اور پیشین گوئیوں کو سیرۃ النبیؐ میں جگہ دی ہے، جو قرآن مجید اور احادیث صحیحہ میں مذکور ہیں، انھیں کیا پتہ تھا کہ ان کا یہ کمال ان لوگوں کی نظر میں عیب بن جائے گا۔

جو اپنے اور اپنے حلقہ کے علاوہ کسی کو عالم اور محدث ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔

فن حدیث سے ناواقفیت | ترجمان السنۃ کے مصنف کے نزدیک مولانا سید سلیمان ندویؒ کا شمار اصطلاحی لحاظ سے ایک لمحہ کے لیے بھی محدث کی فہرست میں نہیں ہو سکتا، وہ فن حدیث سے بالکل ناواقف اور بے بہرہ تھے، اس سلسلہ میں مولانا بدر عالم نے طعن و تشنیع ہی پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ ایسا نارو ا اور غیر مناسب لب و لہجہ اختیار کیا ہے جس کی توقع ایک عام آدمی سے بھی نہیں کی جا سکتی تھی، چہ جائیکہ ان جیسے استاذ حدیث اور اصطلاحی محدث سے۔ یہ بھی واضح رہے کہ یہ نارو ا اور نامناسب انداز اس شخص کے لیے اختیار کیا گیا ہے جس کو اس عہد کا غزالی و رازی اور ابن تیمیہ و ابن قیم کہنا مبالغہ نہیں ہے۔

مصنف ترجمان السنۃ کے اعتراضات جا بجا اس کثرت سے ہیں کہ ان کو سمیٹنا مشکل ہے، اس لئے ان کا صرف خلاصہ پیش کیا جاتا ہے۔

۱۔ سیرت کے مصنف فن حدیث کے عام اصول اور ان مبادی سے بھی ناواقف اور ناآشنا تھے، جن سے حدیث کی ابتدائی کتابیں پڑھنے والے طلبہ بھی واقف ہوتے ہیں، اسی لیے مولانا بدر عالم نے یہ کرم کیا ہے، کہ حدیث کی تصانیف میں محدثین کے مختلف اسالیب بتائے ہیں، سنن ہدی و سنن زوائد کی تقسیم و تعریف بیان کرنے کی زحمت کی ہے، معجزات پر تصنیفات اور ان کے مصنفین کے نام لکھے ہیں، ضعیف حدیث کی تعریف کر کے اس کی دو قسموں مقبول و مردود کا ذکر کیا ہے، محدثین کی اصطلاح "لا یصح" و "لا یثبت" کا فرق واضح کیا ہے، اور سب سے بڑا کرم یہ کیا ہے کہ صحیح و ضعیف کے معنی میں محدثین کی اصطلاح اور اردو کے استعمال میں جو فرق ہے اسے ظاہر کر دیا ہے۔

۲۔ سیرۃ النبیؐ جلد سوم میں احکام و عقائد اور اعمال و فضائل کی حدیثوں میں کوئی تفریق نہیں کی گئی ہے، بلکہ دونوں طرح کی روایتوں کے رد و قبول میں مشہور حدیث من کذب علی متعمدا فلیتبوأ مقعدہ من النار کے اقتضا کے مطابق یکساں شدت اختیار کرنے پر زور دیا گیا ہے۔ اور "یہ

لکھ ڈالا گیا ہے کہ معجزات ہوں یا فضائل، ضروری ہے کہ آپؐ کی طرف جس چیز کی بھی نسبت کی جائے وہ شک و شبہ سے پاک ہو"

۳۔ من کذب علی... کا تعلق صرف جھوٹی اور موضوع روایتوں سے ہے، سید صاحبؒ کا ضعیف حدیثوں کو بھی اسی لپیٹ میں لے لینا جن کا ایک ایک راوی بیان کر دیا جائے بالکل خلافِ تحقیق اور مذہب جمہور کے خلاف ہے۔

۴۔ سیرت کے مصنف نے محدثین کبار سے بداعتقادی پیدا کی ہے۔ مثلاً حافظ ابن عساکر جیسے شخص کو ضعیف روایتوں کا سرپرست یا مثلاً حافظ ابن حجر کو جس کو محدثین نے حافظ الدنیا کا لقب دیا ہے۔ کمزور روایتوں کا سہارا اور پشت پناہ کہا ہے اور محدثین کبار کی شان میں آزادانہ کلمات استعمال کئے ہیں۔

یہ اور اس قسم کے اور بھی متعدد اعتراضات ہیں جن کا ذکر آگے ضمناً آئے گا۔ اب ہم نمبروار ان کا جائزہ لیتے ہیں۔ معترض کے خیال میں سید صاحبؒ اصطلاحی معنی میں ایک لمحہ کے لئے بھی محدث نہ تھے۔ ممکن ہے ان کی اپنی کوئی مخصوص اصطلاح ہو، جس کی رو سے سید صاحبؒ ایک لمحہ کے لئے بھی محدث نہ قرار پائیں۔ لیکن انھیں حدیث سے بے بہرہ اور اس کے اصول و مبادی سے ناواقف قرار دینا کسی طرح صحیح نہیں ہے، اس کی مختصر تفصیل یہ ہے۔

سید صاحبؒ کو ابتدا ہی سے فن حدیث سے خاص مناسبت رہی ہے، اپنے اسی ذوق کی بنا پر انھوں نے اوائل عمر اور اپنی مضمون نگاری اور تصنیفی زندگی کی ابتدا ہی میں امام بخاریؒ اور امام مالکؒ جیسے اساطین حدیث پر مضامین اور کتابیں لکھیں۔ معارف کے صفحات بھی علم حدیث سے ان کے شغف و انہماک پر شاہد ہیں، ان کی اکثر تصنیفات بھی حدیثی مسائل کی بحث و تحقیق کا شاہکار ہیں، خصوصاً سیرۃ النبیؐ کی جلدوں میں وہ حدیث سے واقفیت اور اس میں تبحر کی ایسی

یادگاریں چھوڑ گئے ہیں جن کی مثال اپنے آپ کو محدث کہلانے والوں کے یہاں بھی نہیں ملے گی۔ اور جلدوں سے قطع نظر صرف تیسری جلد ہی پر اس حیثیت سے ایک نگاہ ڈالی جائے تو اس اعتراض میں کوئی وزن نظر نہ آئے گا کہ نہ سید صاحب محدث تھے اور نہ اس فن سے واقف۔

سب سے پہلے حدیث و شرح حدیث، دلائل، سیر، طبقات، رجال، تاریخ اور تفسیر کی ان کتابوں کی فہرست پیش کی جاتی ہے۔ جن کو کنگھالنے کے بعد یہ جلد مرتب کی گئی ہے۔

صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابی داؤد، جامع ترمذی، سنن نسائی، سنن ابن ماجہ، مسند احمد بن حنبل، مسند اسحاق بن راہویہ، سنن دارمی، مسند ابو داؤد طیالسی، مسند بزاز، مسند حارث، مسند ابویعلی، مسند ابوعوانہ، مسند عبد بن حمید، مسند ابوذر، مسند الفردوس دیلمی، معجم طبرانی، سنن دارقطنی، مستدرک حاکم، تلخیص مستدرک ذہبی، شعب الایمان بیہقی، ادب المفرد امام بخاری، شمائل ترمذی، تاویل مختلف الحدیث ابن قتیبہ، مصنف عبدالرزاق، مصنف ابن ابی شیبہ، زوائد احمد، صحیح ابن خزیمہ، مختارہ ضیا، صحیح ابن حبان، کتاب المائتین صابونی، مشکوۃ المصابیح، کنز العمال، موضوعات ملا علی قاری، امام بغوی، امام ابن السکن، ابن مندہ، ابن شاہین، ابن ابی النجار اور ابن ابی الدنیا کی کتابیں، امام خطابی، امام نووی اور قسطلانی و زرقانی کی شرحیں نیز فتح الباری ابن حجر، امام بیہقی و امام ابونعیم کی دلائل النبوۃ، خصائص کبری سیوطی، شرف المصطفیٰ، سیرت ابن اسحاق، سیرت ابن ہشام، کتاب المغازی واقدی، روض الانف امام سہیلی، طبقات ابن سعد، شرح مواہب، شفا قاضی عیاض، شرح شفا خفاجی، زاد المعاد ابن قیم، استیعاب ابن عبدالبر، اسد الغابہ ابن اثیر، اصابہ ابن حجر، تاریخ ابن جریر، تاریخ ابن اثیر، تاریخ خطیب بغدادی، تاریخ ابن عساکر، تاریخ نیشاپور حاکم، تاریخ ابن کثیر، مختصر تاریخ اسلام ذہبی، تاریخ ابوشامہ، تاریخ الخلفا سیوطی، حلیۃ الاولیا ابونعیم، تاریخ کبیر و صغیر امام بخاری، تفسیر ابن جریر، تفسیر ابوحیان، تفسیر امام رازی، مجمع طبری، قرطبی، تہذیب التہذیب ابن حجر، میزان الاعتدال ذہبی، لسان المیزان ابن حجر۔

اس فہرست میں بعض ایسی کتابوں کے نام بھی ہیں، جو ابھی تک چھپی نہیں ہیں، سید صاحب نے ان کے مخطوطہ نسخے دیکھے ہوں گے یا دوسری مطبوعہ کتابوں سے ان کے حوالے دئے ہوں گے۔ (باقی)

روس کے ایک ممتاز عالم
قاضی عبدالرشید ابراہیم

از- جناب ثروت صولت صاحب، کراچی

تمہید

روس میں جو ممتاز مسلمان ہوئے ہیں۔ ان میں قاضی عبدالرشید ابراہیم کا نام صف اول میں لکھے جانے کے لائق ہے، ایک صحافی، مصنف، ماہر تعلیم، محب وطن، سیاسی رہنما اور مبلغ اسلام کی حیثیت سے انھوں نے جو خدمات انجام دی ہیں ان کو تاریخ کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔ ان کا دائرۂ کار جاپان سے طرابلس اور سویڈن تک پھیلا ہوا تھا۔ ایک سیاح کی حیثیت سے بھی وہ عالم اسلام کے ممتاز سیاحوں میں شامل کئے جا سکتے ہیں۔ بلکہ ترکی میں وہ "سیاح شہیر" کے نام سے زیادہ معروف تھے، لیکن تعجب ہے کہ اس شہرت اور عظمت کے باوجود، دوسری زبانوں کو چھوڑیے خود ترکی زبان میں، میری معلومات کی حد تک ان کی کوئی سوانح عمری دستیاب نہیں۔ حوالے کی بعض کتابوں میں جیسے اشرف ادیب کی "اسلام ترک انسائیکلوپیڈیسی" ابراہیم علاء الدین کی "ترک مشہور لری"۔ اور درگاہ یا ینری کی ترک دیلی و ادبیاتی انسائیکلوپیڈیسی میں، ان کے جو حالات ملتے ہیں وہ بہت ہی مختصر ہیں۔ اور ان کی بعض باتیں خصوصاً سنین کے حوالے ناقابل اعتبار معلوم ہوتے ہیں، میں نے ذیل کے مضمون میں ان کے زیادہ سے زیادہ حالات کو جو مجھے پاکستان میں حاصل ہوسکے ہیں ایک مربوط اور مستند شکل میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگرچہ یہ کوشش بھی

قاضی عبدالرشید کے کارناموں اور حالات کو دیکھتے ہوئے ناقص ہی ہے، لیکن پھر بھی قارئین اس کے ذریعے سے اس عظیم شخص کی خدمات سے بہت کچھ واقف ہوسکیں گے۔

حالات قاضی عبدالرشید نسلاً ازبک تھے۔ اوران کے اجداد خوقند (فرغانہ) کے رہنے والے تھے بعد میں یہ خاندان سائبیریا کے قصبے تارا[۵۷] میں آباد ہوگیا۔ جو شہر توبولسک کے جنوب مشرق میں اور اومسک کے شمال میں دریائے ارتش کے کنارے واقع ہے۔ ان کے دادا ابراہیم تارا میں اخوند ابراہیم کہے جاتے تھے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ عالم کی حیثیت سے شہرت رکھتے تھے۔ عبدالرشید ابراہیم کے والد کا نام عمر آفندی تھا۔ قاضی عبدالرشید تارا میں ۱۸۵۰ء یا ۱۸۵۳ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۵۰ء کی روایت اشرف ادیب کی ہے۔ ابراہیم علاءالدین نے سال پیدائش ۱۸۵۳ء بیان کیا ہے، اور ترک دیلی و ادبیاتی انسی کلوپیدیسی نے بھی اسی کی پیروی کی ہے۔ لیکن ممتاز محقق ذکی ولیدی طوغان نے ان کی عمر ۹۴ سال لکھی ہے جس سے اشرف ادیب کے بیان کی تصدیق ہوتی ہے[۵۸]۔

عبدالرشید ابراہیم نے بیس سال کی عمر تک کشکار (Kishkar) میں ایک مدرسہ میں دینی تعلیم حاصل کی۔ ارطغرل وزداغ نے غالباً اشرف ادیب کے حوالے سے لکھا ہے کہ انھوں نے ایک مدت کرغیز کے صحرائی میدانوں (اسٹیپ کے میدان) میں گشت کرکے تدریس وارشاد کے فرائض انجام دیے۔ اس کے بعد ۱۸۷۷ء میں اپنی تعلیم مکمل کرنے کے لئے وہ

[۵۷] ابراہیم علاءالدین گوڑسا (Gorsa)، ترک مشہورلری ص ۱۴ (پہلا ایڈیشن استنبول) نیز اسلام تورک انسی کلوپیدیسی مجموعہ سی ج ۲ شمارہ ۵۳ ۔ ۵۴ ص ۳ - ۴ [۵۸] ارطغرل د ئد داغ۔ صفحات تدقیقلری۔ ص ۱۵ - ۲۰ (استنبول ۱۹۷۹ء)۔ [۵۹] ارطغرل وزداغ صفحات تدقیقلری ص ۱۹ (استنبول ۱۹۷۹ء)

استنبول گئے۔ وہاں سے وہ مکہ اور مدینہ گئے۔ مکہ میں ان کی ملاقات قفقاز کے عظیم مجاہد شیخ شامل سے ہوئی اور عبدالرشید ان سے متاثر ہوئے۔ اشرف ادیب کے خیال میں قاضی عبدالرشید کو ایک بے باک مجاہد بنانے میں اس ملاقات کا بڑا اثر ہے[۶۰]۔ لیکن اشرف ادیب کا یہ بیان محل نظر ہے۔ کیونکہ امام شامل ۱۸۷۰ء میں حج کرنے کے بعد اور مدینہ میں چھ ماہ قیام کے بعد فروری ۱۸۷۱ء میں وفات پاچکے تھے[۶۱]۔ اب یا تو یہ ملاقات نہیں ہوئی۔ اور اگر ہوئی تو ۱۸۷۰ء میں حج کے دوران ہوئی ہوگی۔ اور عبدالرشید کشکار میں تعلیم مکمل کرکے اس سال حج کو گئے ہوں گے۔ امام شامل سے ملاقات کے بعد وطن واپس آگئے ہوں گے، اور چند سال اسٹیپ کے میدانوں میں درس وارشاد میں مصروف رہنے کے بعد ۱۸۷۷ء میں استنبول گئے ہوں گے۔ اشرف ادیب قاضی صاحب کے دوستوں میں سے تھے۔ اس لئے انھوں نے امام شامل سے ملاقات کا ذکر کرنے میں غلط بیانی نہیں کی ہوگی۔ ہاں سال ملاقات بیان کرنے میں غلطی ہوسکتی ہے۔

ابراہیم علاءالدین نے لکھا ہے کہ استنبول میں قیام کے دوران ان کی نامق کمال (۱۸۴۰ء تا ۱۸۸۸ء)، اور احمد وفیق پاشا (۱۸۲۳ء تا ۱۸۹۱ء) جیسے بیدار مغز دانشوروں سے ملاقات ہوئی۔ اشرف ادیب نے ممتاز ادیب معلم ناجی (۱۸۵۰ء تا ۱۸۹۳ء) اور احمد مدحت (۱۸۴۴ء تا ۱۹۱۲ء) کے علاوہ جمال الدین افغانی سے بھی ملاقات کا ذکر کیا ہے۔ ان ملاقاتوں کے نتیجے میں قاضی عبدالرشید کو روس میں مسلمانوں کے نظام تعلیم کی کمزوریوں کا احساس ہوا اور انھوں نے استنبول کے اخبار بصیرت میں اس سلسلے میں ایک مضمون لکھا جس کا عنوان "اسلامی مکتبوں میں تدریس وتعلیم کا پروگرام" تھا۔

[۶۰] زکی ولیدی طوغان، خاطرہ لر ص ۳۰۲ (استنبول ۱۹۶۹ء)، [۶۱] ہزال او غلو مصطفیٰ ذہنی: شیخ شامل۔ ص ۶۴ (انقرہ ۱۹۵۸ء)

بصیرت ترکی کا ممتاز روزنامہ تھا۔ ۱۸۶۹ء سے نکلنا شروع ہوا تھا۔ اور ۱۴ اپریل ۱۸۷۸ء تک جاری رہا۔ اس لیے اس کا امکان ہے، کہ قاضی عبد الرشید نے یہ مضمون ۱۸۷۰ء میں استنبول میں قیام کے اسی زمانے میں لکھا ہو۔ لیکن جمال الدین افغانی سے ان کی ملاقات اس زمانے میں ثابت نہیں ہوتی۔ جمال الدین پہلی مرتبہ ۱۸۷۰ء میں ترکی آئے تھے۔ اور ۱۸۷۱ء میں شیخ الاسلام کی مخالفت کی وجہ سے چلے گئے تھے۔ اس کے بعد وہ ۱۸۹۲ء میں ترکی آئے، اور ۱۸۹۷ء میں اپنی وفات تک ترکی میں رہے۔ اب یا تو ۱۸۷۰ء میں حج کے لیے جاتے وقت[1] قاضی عبد الرشید کی جمال الدین افغانی سے ملاقات ہوئی ہوگی یا پھر ۱۸۹۲ء اور ۱۸۹۷ء کے درمیان۔ اشرف ادیب نے لکھا ہے کہ عبد الرشید ابراہیم ۱۸۹۵ء میں، روس چھوڑ کر استنبول آنے پر مجبور ہوئے تھے۔

ابراہیم علاء الدین نے لکھا ہے کہ قاضی عبد الرشید نے وطن واپس جاکر مسلمان ترکوں کے لیے استنبول کے مدرسوں کے اصول پر مدرسہ قائم کیا۔ اشرف ادیب نے لکھا ہے کہ ترکی سے سائبیریا[2] واپس جانے کے بعد قاضی رشید نے وہاں اسلامی خدمات انجام دیں، وہ اوفا میں روسی مسلمانوں کی مرکزی تنظیم[3] کی علاقائی شاخ کے صدر ہوئے، اس کے بعد مرکزی سربراہ کے دفتر کے رکن منتخب ہوئے غالباً اسی زمانے میں ان کے نام کے ساتھ قاضی کے لفظ کا اضافہ ہوا ہوگا۔

قیام ترکی قاضی عبد الرشید غلامی کی زندگی پر ہجرت کو ترجیح دیتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے استنبول میں قیام کے زمانے میں "لواء الحمد" کے نام سے رسالے لکھے۔ اور ان کو چھاپ کر خفیہ طور پر روس پہنچایا ان کی

[1] اس زمانے میں روس کے مسلمان استنبول کے راستے حج کو جایا کرتے تھے۔ [2] ترک مصنف یورال اور والگا کے علاقے کو جس میں کازان اور بشکیریا کی ریاستیں ہیں۔ اکثر سائبیریا۔ اور مغربی سائبیریا لکھتے تھے
[3] اس سے مراد روسی مسلمانوں کی وہ مرکزی تنظیم ہے جسے ۱۷۸۸ء میں دینی معاملات کی دیکھ بھال کے لیے ملکہ کیتھرائن دوم کے حکم سے قائم کیا گیا تھا۔ آج کل اسے مذہبی نظامت کہا جاتا ہے۔

ترغیب و تحریص سے ستر ہزار[1] روسی مسلمان ہجرت کر کے ترکی چلے آئے، اس کثرت سے لوگوں کے ترکی پہنچنے کی وجہ سے بڑا مسئلہ پیدا ہو گیا، اور مہاجرین کی ایک تعداد کو واپس روس جانا پڑا۔

ہمیں نہ تو قاضی عبد الرشید کے اوفا کی مذہبی نظامت کی رکنیت کے زمانے کی تاریخ و سال معلوم ہیں، اور نہ لواء الحمد کی طباعت اور روسی مسلمانوں کی ہجرت کی تاریخ معلوم ہے غالباً یہ واقعات ۱۸۹۵ء کے بعد کے ہیں کیونکہ اشرف ادیب کی تصریح کے مطابق قاضی عبد الرشید ۱۸۹۵ء میں روس چھوڑ کر استنبول آنے پر مجبور ہوئے تھے، اسی زمانے میں انھوں نے چولپان یلدزی (ستارہ زہرہ) کے نام سے ایک کتاب لکھ کر شائع کی۔

روس میں واپسی ۱۸۹۵ء کے بعد وہ کتنے عرصے ترکی میں رہے یہ نہیں معلوم لیکن ۱۹۰۲ء میں وہ ہمیں پھر روس میں نظر آتے ہیں۔ روس میں مسلمانوں کو اخبار اور رسالے نکالنے کی اجازت نہیں تھی، پوری سلطنت میں مسلمانوں کا صرف ایک اخبار ترجمان تھا، جسے مشہور مسلمان رہنما اسماعیل گسپرالی ۱۸۸۳ء سے کریمیا سے شائع کر رہے تھے، مسلمان اس کمی کو ایسے رسالے شائع کر کے پوری کرتے تھے، جو کسی مقررہ میعاد پر نہیں نکلتے تھے، اس قسم کے رسالوں میں قیوم ناصری کا سالنامہ خاص اہمیت رکھتا تھا۔ ۱۹۰۲ء میں عبد الرشید ابراہیم نے اسی قسم کا ایک رسالہ "مراۃ" کے نام سے پیٹرسبرگ سے شائع کرنا شروع کیا، یہ رسالہ ۱۹۰۳ء تک جاری رہا اور چونکہ سال میں کئی مرتبہ شائع ہوتا تھا، اس لئے عبد اللہ بطال کے خیال میں قیوم ناصری کے سالنامے سے زیادہ مفید ثابت ہوا۔[2]

فروری ۱۹۰۵ء میں روس میں مشروطی انقلاب آگیا، زار کی استبدادی حکومت

[1] ابراہیم علاء الدین نے مہاجرین کی تعداد ایک لاکھ لکھی ہے، [2] عبد اللہ بطال۔ قازان تورکلیری۔ ص ۱۶۷، ۱۶۸۔

ختم ہوئی، اور ایک پارلیمنٹ قائم کر دی گئی جسے دوما کہا جاتا تھا، سیاسی پارٹیوں کے قیام اور اخبار رسالے نکالنے کی اجازت بھی مل گئی، مسلمانوں نے بھی ۱۹۰۵ء میں پانچ، ۱۹۰۶ء میں چودہ اور ۱۹۰۷ء میں بارہ اخبارات ترکی زبان میں نکالے[1]۔ قاضی عبدالرشید نے کازان سے "الفت" نامی اخبار ۱۹۰۵ء میں نکالا جو ۱۹۰۷ء تک جاری رہا[2]، ممتاز عالم اور سیاسی رہنما موسیٰ جاراللہ نے اپنی مضمون نگاری کا آغاز اسی اخبار سے کیا تھا[3]۔

سیاسی سرگرمیاں

قاضی عبدالرشید نے اپنے اخبار کے ذریعے قومی امنگوں کی ترجمانی کرنے کے علاوہ سیاسی زندگی میں بھی عملی حصہ لیا۔ روس کے مسلمانوں نے اپنے مطالبات مرتب کرنے کے لیے تین کل روس مسلمان کانگریس منعقد کی تھیں، پہلی مئی ۱۹۰۵ء میں ہوئی تھی، دوسری جنوری ۱۹۰۶ء میں اور تیسری ۱۶ - ۲۱ اگست ۱۹۰۶ء میں ہوئی تھی، یہ تیسرا اجتماع شہر نخنی نوود گورود میں قاضی عبدالرشید ابراہیم کی کوششوں سے ہوا تھا[4]۔ اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے عبدالرشید ابراہیم نے کہا

"اس صدی میں مسلمانوں اور اسلام کے خلاف ہر میدان میں مسیحی مبلغوں کی سرگرمیاں بڑھ گئی ہیں۔ انھوں نے مدرسوں، مسجدوں اور بستیوں میں انتہائی ظالمانہ طریقہ اختیار کر رکھا ہے، اور حکومت ان کی حمایت کرتی ہے۔ مسلمانوں کی دینی حالت کی طرف سے بہت غفلت برتی جا رہی ہے، لہذا اس اجتماع میں اس خرابی پر بحث کرنا اور اس کا علاج تلاش کرنا ضروری ہے، ہمیں اپنے دین کو اور اپنی قوم کو مسیحی مبلغوں کی یلغار سے بچانا چاہیے[5]"

اس اجتماع کی ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ اس میں عبدالرشید ابراہیم نے پہلی مرتبہ سوشلزم کی

---

[1] عبداللہ ... - کازان الو تورہ کلیری، ص ۱۰۳-۱۰۴، [2] ارطغرل دُزداغ۔ صفحات تدقیقلری ص ۱۹ (استنبول ۱۹۶۹ء)، [3] حلمی ضیا - ترکی میں جدید افکار کی تاریخ (ترکی زبان)،

[4] بائے مرزا حائٹ - ترکستان روس اور چین کے درمیان (ترکی زبان) ص ۲۰۰ (استنبول ۱۹۷۵ء)،

[5] ایضاً

حمایت کی، اور کہا کہ سوشلزم ہمارے دین کی بنیاد ہے۔ اور ہمارے رسولؐ کے صحابہؓ نے ہر فیصلہ باہمی اشتراک سے کیا۔ بائے مرزا حائٹ (HAYIT) عبدالرشید ابراہیم کے اس خیال پر تعجب کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ انھوں نے سوشلزم کی اصطلاح کس وجہ سے استعمال کی اور اس کو صحابہ کی طرف کس طرح منسوب کیا، یہ بات میں سمجھ نہیں سکا، لیکن حاضرین میں سے کسی نے اس بات کے خلاف آواز بلند نہیں کی[1]

یہ بات واقعی تعجب انگیز اور تحقیق طلب ہے، کیونکہ قاضی عبدالرشید کی اگلی اور پچھلی سرگرمیاں سوشلزم کی تائید نہیں کرتیں ممکن ہے، انھوں نے سوشلزم کو مساوات کے معنوں میں استعمال کیا ہو جیسا کہ بعض لوگ جن کا مارکسزم سے تعلق نہیں ہوتا، اب بھی اس اصطلاح کو عدل اجتماعی کے معنوں میں استعمال کرتے ہیں،

روسی مسلمانوں کی یونین کی سربراہی

مسلمانوں کا مذکورہ بالا اجتماع اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ اس میں "روسیا مسلمانلری اتفاق" یعنی روسی مسلمانوں کی یونین کے نام سے ایک تنظیم قائم کی گئی، اور اس کے لیے ۷۰ دفعات پر مشتمل ایک پروگرام تیار کیا گیا، جو مسلمانان روس کے سیاسی اقتصادی، اجتماعی اور دینی مطالبوں پر مشتمل تھا، اس پروگرام میں مسلمانوں کے لیے بنیادی حقوق اور خودمختاری کا مطالبہ بھی کیا گیا تھا، کانگریس نے پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے لیے پندرہ افراد پر مشتمل ایک مجلس عاملہ کا دو سو انیس ووٹوں سے انتخاب بھی کیا، اور قاضی عبدالرشید کو اس کی سربراہی سپرد کی، مجلس عاملہ میں یوسف آقچورہ، اسماعیل گسپرالی، مفتی عالم جان بارودی، صدری مقصودی اور موسیٰ جاراللہ جیسی عظیم شخصیتیں شامل تھیں، جو بلاشبہ روس کے مسلمانوں کی ممتاز ترین شخصیتیں تھیں، ان کی موجودگی میں مجلس عاملہ کی سربراہی قاضی عبدالرشید

---

[1] بائے مرزا حائٹ - ترکستان روس اور چین کے درمیان ص ۲۰۰ (استنبول ۱۹۷۵ء)

کے سپرد کیا جانا ان کی غیر معمولی صلاحیت اور خدمات کا ثبوت ہے۔[1]

۱۰ مئی ۱۹۰۶ء کو پہلی دوما کے انتخاب میں مسلمانوں کے پچیس نمائندے منتخب ہوئے، لیکن زار نے گیارہ دن بعد ۲۱ مئی کو دوما توڑ دی، دوسری دوما کا انتخاب ۵ مارچ ۱۹۰۷ء کو ہوا، اور اس میں مسلمانوں کے ۳۵ نمائندے منتخب ہوئے، لیکن زار نے ۱۶ جون ۱۹۰۷ء کو یہ دوما بھی توڑ دی، روس حکومت نے اس پر ہی بس نہیں کیا، بلکہ سیاسی سرگرمیوں پر بھی پابندیاں لگا دیں اور اخبارات بھی بڑی تعداد میں بند کر دیے گئے ۱۹۰۷ء کے آخر میں جو تیسری دوما منتخب ہوئی اور جو ۱۹۱۲ء تک قائم رہی نئے انتخابی قوانین کے تحت منتخب ہوئی تھی، جن کے تحت ترکستان اور قفقاز کو نمائندگی سے محروم کر دیا گیا تھا کیونکہ یہ نوآبادیاں تھیں، صرف کازان اور یورال کے تاتاریوں کو انتخاب میں حصہ لینے کا حق دیا گیا، ۱۹۰۸ء میں "الفت" اخبار بھی بند ہو گیا، ان پابندیوں کی وجہ سے کئی مسلمان رہنما دل برداشتہ ہو کر ہجرت کر کے ترکی چلے گئے، ان میں یوسف آقچورہ، عیاض اسحاقی، اور علی حسین زادہ کے نام قابل ذکر ہیں، قاضی عبدالرشید بھی کچھ مدت کے لیے باہر چلے گئے، اور اشرف ادیب کے بیان کے مطابق ممالک اسلامیہ کی سیر کرتے ہوئے جاپان تک گئے، اپنی اس سیاحت کے تاثرات وہ کازان سے نکلنے والے اخبار "بیان الحق" میں اشاعت کے لیے بھیجتے رہے، اور جب ترکی میں ۲۴ جولائی ۱۹۰۸ء کو مشروطیت کا اعلان ہو گیا تو استنبول کے اخباروں میں مضامین بھیجتے رہے۔[2]

قاضی عبدالرشید کی جلاوطنی | کتاب "بدیع الزمان سعید نورسی" کے ترک مصنف نجم الدین شاہینر (Shahiner) نے لکھا ہے کہ:

"عبدالرشید ابراہیم کو روسیوں نے اپنے لیے خطرناک جان کر ۱۹۰۸ء میں موسیٰ جاراللہ کے ساتھ جلاوطن کر دیا تھا، دونوں نے جاپان میں پناہ لی اور وہاں اسلام کی

[1] اس کانگریس کی تفصیلی روئیداد اور پروگرام کا متن موسیٰ جاراللہ نے ۱۹۰۶ء میں کازان سے شائع کر دیا تھا پروگرام کے خلاصے کے لیے دیکھیے مرزا حاتم کی مذکورہ بالا کتاب کا ص ۱۰۲ نیز زینکووسکی Zenkovsky کی کتاب "پان ترکزم" ص ۴۰۔۴۸ [2] از طغرل دزداغ :۔ صفحات تدقیقلری۔ ص ۱۹۸

اشاعت کے سلسلے میں عظیم خدمات انجام دیں۔ عبدالرشید ابراہیم نے پورے جاپان اور چین کی سیر کی اور چینی مسلمانوں کے حالات کا مشاہدہ کیا، جن کی تعداد اس وقت چار کروڑ تھی، عبدالرشید نے محسوس کیا کہ ان مسلمانوں کو تعلیم و تربیت کی بڑی ضرورت ہے چنانچہ اس کام میں مدد لینے کے لیے، اور علماء کی ایک تعداد چین بھیجنے کے لیے وہ استنبول آئے اور سلطان عبدالحمید سے مدد کی درخواست کی، سلطان نے اس درخواست پر مثبت ردعمل کا اظہار کیا، اور شیخ الاسلام جمال الدین کو حکم دیا کہ وہ قاضی عبدالرشید کی ہر ممکن مدد کریں۔"[1]

اس روایت کا یہ حصہ غلط ہے۔ کہ عبدالرشید کو موسیٰ جاراللہ کے ساتھ جلاوطن کیا گیا تھا۔ موسیٰ جاراللہ کئی سال مصر میں تعلیم پانے کے بعد حجاز اور ہندوستان ہوتے ہوئے ۱۹۰۴ء میں اپنے وطن روستوف پہنچے تھے: اور ۱۹۰۸ء میں اپنی والدہ کے انتقال تک وہیں رہے، اس کے بعد انھوں نے پیٹرسبرگ جاکر قاضی عبدالرشید کے ساتھ مل کر اخبار "تلمیذ" نکالا،[2] لیکن غالباً یہ اخبار چند ہفتوں کے بعد ہی بند ہو گیا یا حکومت نے بند کر دیا۔ اشرف ادیب نے قاضی عبدالرشید کے ممالک اسلامیہ کی سیر پر روانہ ہونے کا جو ذکر کیا ہے وہ شاید اسی زمانے سے تعلق رکھتا ہے، معلوم ایسا ہوتا ہے کہ قاضی عبدالرشید کو روس سے نکال دیا گیا تھا، وہ چین و کاشغر ہوتے ہوئے جاپان پہنچے، عاکف کے مجموعہ کلام صفحات سے معلوم ہوتا ہے کہ جب ترکی میں ۲۴ جولائی ۱۹۰۸ء کو مشروطیت کی بحالی کا اعلان کیا گیا تو قاضی عبدالرشید حیدرآباد (دکن) میں تھے، اور یہ اعلان سننے کے فوراً بعد

[1] نجم الدین شاہینر: بدیع الزمان سعید نورسی، ص ۴۳، (استنبول ۱۹۷۶ء) یہ واقعہ نجم الدین نے ۱۸۹۱ مورخ جمال قوتائے کی کتاب تاریخ صحتبلری، جلد ۵ ص ۴۴۲ سے نقل کیا ہے، جمال الدین آفندی [illegible] سے فروری ۱۹۰۹ء تک شیخ الاسلام رہے تھے۔ [2] حلمی ضیا الکین: ترکی میں جدید افکار کی تاریخ (ترکی زبان) ص ۲۴۳ (استنبول ۱۹۶۹)

استنبول چلے گئے، غالباً مشرق بعید سے واپسی کا یہ سفر تھا، جس کے بعد انھوں نے سلطان عبدالحمید سے جاپان میں اسلام کی اشاعت میں مدد دینے کی درخواست کی۔

معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد قاضی عبدالرشید جلد ہی پھر جاپان چلے گئے۔ اشرف ادیب لکھتے ہیں کہ جاپان میں قیام

"جاپان میں انھوں نے وسیع تعلقات قائم کیے، دانشوروں سے ملاقاتیں کیں۔ "آسیا گی کائے" یعنی عظیم ایشیا کی جمعیت کے نام سے ایک جماعت قائم کی گئی، جاپانی ان کے ارشاد و تلقین سے مسلمان ہوئے، اور ترکی میں مشروطیت کی بحالی کے بعد عمر یامااوکا کے ساتھ جو جاپان کے اولین مسلمانوں میں سے تھے، استنبول آئے۔"[1]

مذکورہ بالا بیان کی تائید خود ایک جاپانی دانشور عبدالکریم سائیتوہ[2] کے ایک مضمون سے ہوتی ہے، جو انھوں نے مسلمان اقلیتوں کے انسٹی ٹیوٹ واقع جدہ کے مجلہ "جرنل" میں لکھا ہے، وہ کہتے ہیں:

"۱۹۰۹ء میں ایک ترک عبدالرشید ابراہیم جو روس میں پیدا ہوئے تھے، جاپان آئے، تاتاریوں کی آزادی کے لیے جدوجہد کرنے کی وجہ سے ان کو روس سے جلاوطن کر دیا گیا تھا، جاپان آنے سے پہلے وہ کاشغر گئے تھے تاکہ اپنی تحریک کے لیے تائید حاصل کریں، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انھوں نے انور پاشا کے ساتھ ملکر جنگ میں حصہ لیا تھا، عبدالرشید ابراہیم جاپانی سپہ سالار جنرل اکاشی (Akashi) کے اچھے دوست تھے، اور جنرل موصوف نے جاپان آنے میں ان کی مدد کی تھی۔ وہ ایک پارسا اور نیک مسلمان تھے،

---

[1] ارطغرل وزداغ: صفحات تذ کیقری. ص ۱۹۰ [2] عبدالکریم سائیتوہ (Saitoh) ٹوکیو کی تاکوشوکو یونیورسٹی میں تاریخ اور فارسی کے پروفیسر ہیں، وہ جاپانی مسلمانوں کی پہلی تنظیم جاپان مسلم ایسوسی ایشن کے صدر بھی رہ چکے ہیں، اور اب نوتشکیل یافتہ اسلامی تنظیموں کی کونسل کی رابطہ کمیٹی کے صدر ہیں، جو المرکز الاسلامی جاپان کے نام سے کام کر رہی ہے۔

اور شاید جاپان میں پہلے مسلمان مبلغ اسلام تھے، ان کی وجہ سے کئی جاپانیوں نے اسلام قبول کیا۔ ۱۹۴۴ء میں جاپان میں ان کا انتقال ہوا، جن لوگوں نے عبدالرشید ابراہیم کی بدولت اسلام قبول کیا، ان میں سب سے ممتاز کوتارو یامااوکا (Kotaro Yamaoka) کی شخصیت ہے جو ۱۸۸۰ء میں ہیروشیما میں پیدا ہوئے تھے، ٹوکیو میں واقع بیرونی زبانوں کے مدرسے کے فارغ التحصیل تھے، اور ۱۹۰۴ء تا ۱۹۰۵ء کی روسی جاپانی جنگ میں حصہ لیا تھا، جنگ کے بعد عبدالرشید ابراہیم سے ان کی ملاقات ہوئی، اور ان کے ساتھ انھوں نے ۱۹۰۹ء میں حج کیا، وہ اتحاد ایشیا اور اتحاد اسلام کے بڑے علمبردار تھے۔"[1]

ایک اور ممتاز جاپانی دانشور الحاج ابوبکر موری موتو نے جنھوں نے ۱۹۶۵ء میں اسلام قبول کیا تھا، ٹوکیو کے انگریزی رسالے "اسلامک کلچر فورم" کی اپریل ۱۹۷۹ء کی اشاعت میں وضاحت کی ہے کہ عمر تسوتارو یامااوکا پہلے جاپانی مسلمان تھے، جنھوں نے فریضۂ حج ادا کیا، اور ان کی اپنی لکھی ہوئی کتاب کے مطابق انھوں نے یہ حج ۱۹۰۹ء میں کیا تھا۔[2]

اشرف ادیب نے قاضی عبدالرشید اور عمر یامااوکا کے استنبول آنے کا ذکر کیا ہے، لیکن حج کا ذکر نہیں کیا، یہ بات ہمیں عبدالکریم سائیتوہ اور ابوبکر موری موتو کے بیان سے معلوم ہوئی ہے لیکن اس جگہ مشکل یہ ہے کہ ۱۹۰۹ء میں دو حج ہوئے تھے، ایک ۳ جنوری ۱۹۰۹ء کو (۱۰ ذی الحجہ ۱۳۲۶ھ)

---

[1] Journal (جدہ) جلد اول شمارہ اول ۱۹۷۹ء۔ عبدالکریم سائیتوہ کے اس مضمون کا اردو ترجمہ ستمبر ۱۹۸۲ء کے فکر و نظر (اسلام آباد) میں شائع ہو چکا ہے، یہ ترجمہ میری زیر طبع کتاب تاریخ اسلام کا مطالعہ" حصہ دوم میں بھی شامل ہے۔ [2] ابوبکر موری موتو کے اس مضمون کے ترجمہ کے لیے ملاحظہ کیجیے روزنامہ جسارت، کراچی ۲۲ر-۲۵ر-اور ۲۶ر جون ۱۹۸۲ء نیز تاریخ اسلام کا مطالعہ جلد دوم۔

اور دوسرا ۲۳ دسمبر/ ۱۰ ذی الحجہ ۱۳۲۷ھ ۱۹۰۹ء کو۔ اب یہ معلوم نہیں کہ عمر یاماادکا نے قاضی عبدالرشید کے ساتھ کونسا حج کیا، قاضی صاحب کے حالات کی مذکورہ بالا ترتیب سے گمان یہی ہے کہ یہ ۱۹۰۹ء کا دوسرا حج ہوگا، اگر کوئی محقق عمر یاماادکا کی کتاب سے مدد لے تو یہ مسئلہ قطعی طور پر حل ہو سکتا ہے، اور ان کے سفر استنبول پر بھی روشنی پڑ سکتی ہے۔

قاضی عبدالرشید استنبول میں | معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد قاضی عبدالرشید، استنبول میں رہ گئے، کیونکہ ان کے سفرنامہ کی پہلی جلد مطبع احمد ساقی بے استنبول سے اگلے سال، اور دوسری جلد قدر مطبع سی سے ۱۳۲۹ھ میں شائع ہوئی، اس سفر پر ہفت روزہ صراط مستقیم، یکم جولائی ۱۹۱۰ء شمارہ ۹۵ کی اشاعت میں ترکی کے شاعر اسلام محمد عاکف نے تبصرہ کرتے ہوئے اسکو انتہائی اہم کتاب قرار دیا، طغرل وزداغ لکھتے ہیں اپنے سفرنامہ کی اشاعت کے بعد وہ صراط مستقیم کے حلقے میں شامل ہو گئے، جو استنبول میں اسلامی فکر رکھنے والے مفکروں اور مصنفوں اور جس کے ناشر اشرف ادیب اور ایڈیٹر محمد عاکف تھے، اب قاضی عبدالرشید کی تقریریں وعظ اور مضامین بھی اس رسالے میں شائع ہونے لگے[1]۔

عاکف اور قاضی عبدالرشید | عاکف اور قاضی عبدالرشید میں جلد ہی گہرے تعلقات قائم ہو گئے، دونوں ایک دوسرے کی صلاحیتوں کے مداح تھے، ایک مرتبہ قاضی عبدالرشید نے عاکف سے کہا "عاکف تمہارے اشعار دلوں میں آگ لگا دیتے ہیں، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں، بوڑھا ہو گیا ہوں اور جان قربان کر دینے کا زمانہ گزر گیا، اگر یہ اشعار تم نے بیس سال پہلے کہے ہوتے تو میرے لیے بڑی قوت کا باعث ہوتے، میں نے سارے ایشیا اور افریقہ کی سیر کی ہے لیکن تمہاری طرح کا شاعر کہیں نہیں دیکھا۔"[2]

---

[1] ارطغرل وزداوغ۔ صفحات تقبقری۔ ص ۱۹۹۔ [2] ارطغرل وزداغ۔ صفحات تقبقری ص ۱۹۹۔۲۰۰ بحوالہ کتاب محمد عاکف مرتبہ اشرف ادیب۔ ص ۲۳۰ (استنبول ۱۹۳۸ء)

عاکف بھی اسی طرح قاضی عبدالرشید کے مداح تھے، ان کے مجموعۂ کلام "صفحات" کی دوسری نظم "سلیمانیہ کرسی سندہ" (جامع سلیمانیہ کے منبر پر) میں عاکف نے جس واعظ کا ذکر کیا ہے، وہ قاضی عبدالرشید ابراہیم ہی ہیں، اس نظم میں عاکف نام لیے بغیر ان کا تعارف اس طرح کراتے ہیں۔

"منبر پر کون تھا؟ ایک بوڑھا تھا جس کو میں جانتا نہیں تھا لیکن چہرے بشرے میں ایک جاذبیت تھی، کہ وہ دل کو اجنبی نہیں لگتا تھا، سفید داڑھی، سفید دستار، کشادہ پیشانی اور محبت بھری نظریں، لوگوں نے اس کو اس طرح گھیرے میں لے رکھا تھا، جیسے چاند کے گرد ہالا ہوتا ہے، اس کے چہرے سے کیسا جلال و جمال نمایاں تھا۔"

عاکف نے اس نظم میں جو جنگ طرابلس کے بعد ۱۹۱۲ء میں لکھی تھی، دنیائے اسلام کا جو نقشہ کھینچا ہے، اور اپنے جن خیالات کا اظہار کیا ہے، وہ اسی واعظ یعنی قاضی عبدالرشید کی زبان سے کیا ہے، عاکف پر ان کی کتاب "دنیائے اسلام" نے گہرا اثر ڈالا تھا، اور وہ بعض اوقات قاضی عبدالرشید سے افطار کے وقت سے سحری کا وقت ہونے تک دنیائے اسلام اور مسلمانوں کی زبوں حالی کے حالات اور مسائل پر گفتگو کرتے رہتے تھے[1]۔

قاضی عبدالرشید ترکی میں | ابراہیم علاءالدین نے اس زمانے کی ان سرگرمیوں پر صرف ایک جملہ لکھا ہے کہ قاضی عبدالرشید نے ۱۹۰۸ء کے انقلاب کے بعد ترکی آکر اتحاد اسلام اور اتحاد ترک کا پروپیگنڈہ کیا۔[2] ارطغرل وزداغ نے اس میں مزید اضافہ کرتے ہوئے یہ بھی بتایا ہے کہ عبدالرشید طرابلس پر

---

[1] اشرف ادیب۔ محمد عاکف ص ۲۳۶ - ۲۳۹ (بحوالہ صفحات تقبقری ص ۱۱۱)

[2] علاءالدین ابراہیم: تورک مشہورلری انسی کلوپیدیسی۔ ص ۱۳۔

اٹلی کے حملے کے موقع پر (۱۹۱۱ء) طرابلس گئے تھے، اور وہاں افریقہ کی اسلامی تحریک میں شرکت کی، پھر پہلی عالمی جنگ اور بالشویک انقلاب کے بعد مشرقی ترکستان جاکر انھوں نے وہاں کی سرگرمیوں میں حصہ لیا، کاشغر جانے اور انور پاشا کے ساتھ ملکر جنگ کرنے کا اشارہ ڈاکٹر عبدالکریم سائیتوہ نے بھی کیا ہے، جس کا تذکرہ اوپر کیا جاچکا ہے۔

لیکن ڈاکٹر بائے مرزا حافظ نے جو معلومات اس سلسلے میں فراہم کی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ جنگ عظیم کے زمانے میں اور اس کے فوراً بعد قاضی عبدالرشید اپنے وطن کی آزادی کے سلسلے میں یورپ میں زیادہ مصروف رہے، اور اگر وہ ترکستان گئے تو جنگ کے بعد گئے، بائے مرزا حافظ ۱۹۰۶ء کی تیسری کل روسی مسلم کانگریس کی قراردادوں اور پروگرام کے تذکرے کے بعد لکھتے ہیں کہ جب کانگریس کے تحت قائم کردہ مجلس عاملہ جس کے صدر عبدالرشید ابراہیم تھے، روسی حکومت سے اپنے مطالبات نہ منوا سکی تو مسلمان روسی حکومت کی طرف سے مایوس ہوگئے، لیکن جب جنگ عظیم شروع ہوئی تو اس مجلس کے دو ارکان یوسف اقچورہ اور عبدالرشید ابراہیم نے یورپ جاکر اپنے مطالبات کے حق میں رائے عامہ ہموار کرنے کی کوشش کی، یوسف اقچورہ نے برلن میں ۱۹۱۵ء میں ایک انجمن قائم کی جس کا نام "جمعیت تحفظ حقوق اقوام ترک و تاتار" تھا۔ اور عبدالرشید ابراہیم نے اسٹاک ہالم (سویڈن) میں ایک کانفرنس میں روسی مسلمانوں کی نمائندگی کی۔ یہ کانفرنس سلطنت روس کے غیر روسی باشندوں کی ایک جمعیت نے طلب کی تھی [1]۔ اس جمعیت نے ۹ مئی ۱۹۱۶ء کو ایک یادداشت امریکہ کے صدر ولسن کو پیش کی جس میں روسی مسلمانوں پر ہونے والے مظالم کا تذکرہ کیا گیا تھا [2]۔

---

[1] ارطغرل وزداغ، صفحات تدقیقلری۔ ص ۲۰۰۔ ارطغرل وزداغ کی اس معلومات کا ماخذ غالباً ڈاکٹر ادیب کا وہ مضمون ہے جو انھوں نے اسلام ترک انسائیکلوپیدیسی مجموعہ سی جلد ۲ شمارہ ۵۳ - ۵۴ میں صفحہ ۳-۴ پر لکھا تھا اور جس کا حوالہ خود ارطغرل وزداغ نے صفحات تدقیقلری میں دیا ہے۔ [2] بائے مرزا حافظ، ترکستان روس اور چین کے درمیان (ترکی زبان) ص ۲۰۲ (استنبول ۱۹۷۵ء)

اشتراکی انقلاب | روس میں اکتوبر ۱۹۱۷ء میں اشتراکی انقلاب آجاتا ہے، اور زار کی حکومت ختم کردی جاتی ہے، روس کی محکوم قومیں موقع سے فائدہ اٹھاکر اپنی اپنی آزادی کا اعلان کردیتی ہیں، مسلمان بھی حالات سے فائدہ اٹھاتے ہیں، اور اشتراکی رہنما بھی ان کو آزادی دینے کا اعلان کردیتے ہیں، کل روس مسلم اجتماعات کا سلسلہ جو ۱۹۰۶ء کی تیسری مسلم کانگریس کے بعد بند ہوگیا تھا، پھر شروع ہوجاتا ہے۔

فروری ۱۹۱۷ء میں کریمیا کے مسلمان آزادی کا اعلان کردیتے ہیں، ۲۲ جنوری ۱۹۱۷ء کو ایدل یورال کے مسلمان، ۱۵ نومبر ۱۹۱۷ء کو باشقردستان، ۱۰ دسمبر ۱۹۱۷ء کو قازقستان کے مسلمان، ۱۱ مئی ۱۹۱۸ء کو داغستان کے مسلمان اور ۲۸ مئی ۱۹۱۸ء کو آذربائیجان کے مسلمان بھی آزادی کا اعلان کردیتے ہیں۔ ترکی میں "لشکر اسلام" منظم کیا جاتا ہے، اور عثمانی ترکوں کی فوجیں اپنے بھائی ترک مسلمانوں کی آزادی میں مدد دینے کے لیے قفقاز کے علاقے میں پیش قدمی کرتی ہیں، اور ۱۵ ستمبر ۱۹۱۸ء میں باکو پر قابض ہوجاتی ہیں، اور داغستان کے شہر دربند تک پہنچ جاتی ہیں، لیکن اس کے بعد جنگ کا پانسہ پلٹ جاتا ہے، اور ۳۰ اکتوبر ۱۹۱۸ء کو ترکی اتحادیوں کے آگے ہتھیار ڈالدیتا ہے، اور اپنی فوجوں کو قفقاز سے واپس بلالیتا ہے، روسی اشتراکی بھی اپنے اعلان سے پھر جاتے ہیں، روسی مسلمانوں کی امیدیں خاک میں مل جاتی ہیں، تمام مسلمان ریاستوں کی آزادی بزور قوت ختم کردی جاتی ہے، یہاں تک کہ اگست ۱۹۲۲ء میں تاجکستان کے پہاڑوں میں انور پاشا کی شہادت کے ساتھ روسی مسلمانوں کی آزادی کی جدوجہد کا یہ باب بند ہوجاتا ہے۔

آثار علمیہ و تاریخیہ

مولانا حمید الدین فراہی کا ایک غیر مطبوعہ خط

از شرف الدین اصلاحی

حضرت قبلہ وکعبہ جناب والد ماجد مدظلہم

پس از تسلیم معروض ہے، خدائے پاک کا شکر ہے کہ اچھی طرح ہوں، اب مجھے ہر طرح سے اطمینان حاصل ہو گیا انشاء اللہ بہت جلد عریضہ ارسال خدمت کیا کروں گا، اس سے پہلے جو کچھ ارسال عریضہ میں تقصیر ہوئی ہے اس کی معافی کی امید رکھتا ہوں، جناب مولانا کے مکان کے اوپر ایک کوٹھا ہے، جس میں مولوی محمد شبلی صاحب رہا کرتے تھے، میں نے ایک روپیہ آٹھ آنے کرایہ پر لے لیا ہے، دن بھر حضرت مولانا ہی کی خدمت میں رہتا ہوں، اور اس لیے میں نے اس مکان کو لیا کہ مولانا سے قرب رہے، عنقریب مولوی عبد اللہ ایک شخص اسی کوٹھے پر آئیں گے جب کرایہ میں مجھے تخفیف ہو جائے گی، ابھی مجھے کوئی ضرورت نوکری کی نہیں معلوم ہوتی مقدمہ کی کیا حالت ہے، عزیزی عبد الرشید و صدر الدین کیا پڑھتے ہیں، حسب ارشاد میں نے ایک انٹرنس پاس لڑکے سے جو مجھ پر نہایت مہربان ہے انگریزی شروع کر لی، پرسوں انشاء اللہ صدر ادو، پانچ چھ روز میں اگر خدائے پاک نے چاہا تو حساب شروع ہو جائے گی، اس بات پر مجھے بڑی ندامت معلوم ہوتی ہے کہ جواب عریضہ جلد آتا ہے، اور مجھ سے دیر ہو جاتی ہے مگر اب انشاء اللہ ہرگز دیر نہ ہوگی۔ فقط

زیادہ حد ادب

بخدمت جناب والدہ صاحبہ و ہمشیرہ صاحبہ و والدہ شاں تسلیم قبول باد و بہمہ عزیزان دعا و سلام

۱۲ عبد الحمید[1]

محررہ بالا خط ہمیں محترم مولوی ابو سفیان صاحب اصلاحی نے موضع ہمئی پور ضلع اعظم گڈھ یوپی۔ انڈیا سے بھیجا ہے، ابو سفیان صاحب پرانے اصلاحیوں میں سے ہیں اور عمر کی اس منزل میں ہیں کہ انیس کی طرح زبان قال سے نہیں تو زبان حال سے کہہ سکتے ہیں۔

> انیس دم کا بھروسا نہیں ٹھہر جاؤ
> چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے

جس خط کو انھوں نے زندگی کی متاع عزیز سمجھ کر مدت مدید سے چھپا کے رکھا تھا اسے اب یہ سمجھ کر میرے حوالہ کر دیا ہے کہ شاید میرے ذریعہ اس کی حفاظت کا کوئی معقول انتظام ہو جائے، میں نے مولانا فراہی کے متعلق اس طرح کے بہت سے نوادرات جمع کئے ہیں اور ارادہ ہے کہ ان کو ایک مجموعے کی صورت میں چھپوا کر محفوظ کر دیا جائے، یہ ارادہ کب اور کیسے پورا ہوتا ہے اس کا جواب مستقبل کے پردۂ غیب میں مستور ہے لیکن خاص اس خط کے بارے میں اس کی اہمیت کے پیش نظر میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اسے ابھی شائع کر دیا جائے اور مجموعے کی اشاعت کے انتظار میں اسے دوسرے خطوط کی طرح معرض التواء میں نہ رکھا جائے۔

اس خط کی اہمیت مجرد اس کے مضمون سے شاید واضح نہ ہو، جب تک کہ اس کا پس منظر معلوم نہ ہو، پھر خط اتنا خود وضاحتی ہے بھی نہیں، نفس خط کے متعلق بہت سی باتیں وضاحت طلب اور استفہامی نیچر کی ہیں، سب سے پہلا ایک بنیادی سوال تو یہی پیدا ہوتا ہے کہ اس خط کی نسبت مولانا فراہی کی طرف مسلمہ اور ناقابل تردید ہے، یا متنازعہ فیہ بھی ہو سکتی ہے، خط میں مکتوب نگار کا نام عبد الحمید ہے، مکتوب الیہ کا نام پتہ سرے سے موجود نہیں۔

---

[1] ۱۲، کا عدد لفظ حد کی جگہ استعمال ہوتا ہے۔

تاریخ اور مقام یعنی کب اور کہاں سے لکھا گیا یہ بھی مذکور نہیں، خط کے مضمون کا ان امور سے گہرا تعلق ہے، میرے لیے اس خط کی اہمیت اس لحاظ سے ہے کہ میں مولانا فراہیؔ کی سوانح عمری لکھ رہا ہوں، مولانا فراہی کے متعلق اتنا تو معلوم ہے کہ وہ عربی تعلیم کی تکمیل کے لیے کچھ عرصہ اکر لاہورؔ میں رہے، مولانا فیض الحسن سہارنپوری سے جو اورنٹیل کالج لاہور میں عربی ادب کے استاد تھے، کالج میں داخل ہو کر نہیں خارج میں نجی طور پر ان سے تحصیل کی۔

اس حد تک تو ثابت اور مسلّم ہے، لیکن ظاہر ہے اتنی مختصر معلومات سے سوانح حیات کے تقاضے پورے نہیں ہوتے، میں نے تفصیلات کی تلاش میں بہت زور مارا، کیا کیا جتن کیے مگر اس عنوان سے کہیں سے کوئی مواد حاصل کرنے میں کامیابی نہیں ہوئی۔ اگر یہ خط مولانا فراہیؔ کا ہے، اور اس کا تعلق ان کے قیام لاہورؔ سے ہے تو اہل علم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ مولانا فراہی کے سوانح نگار کی حیثیت سے میری نظر میں اس کی اہمیت اور قدر و قیمت کیا ہو سکتی ہے، ابوسفیان اصلاحی کو مولانا فراہیؔ سے جو بھی عقیدت اور محبت ہو وہ مولانا کے حالات زندگی سے اتنے باخبر نہیں ہو سکتے جتنا میں ہوں، میں برسوں سے ان پر کام کر رہا ہوں، ان کی سوانح حیات میرا ریسرچ پروجیکٹ ہے، اس نکتے میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ فراہی شناسی میں مجھے مہارت تامہ یا مہارت نہیں تو شدید اور ابجد خوانی کا درجہ ضرور حاصل ہے، میں نے خط پڑھا تو پڑھتے ہی بادل وہلہ جو خیال میرے ذہن میں بجلی بن کر کوندا اور جس نے میرے دل کو سرور و بہجت سے معمور کر کے سرشار کیا، یہ تھا کہ خط مولانا فراہی کا ہے۔ اور اس کا تعلق ان کے قیام لاہور سے ہے، اس کے ساتھ ہی اس خط میں مذکور ہر بات کا محل بھی متعین ہو کر میرے ذہن میں آ گیا۔ یہ خط میں نے بار بار پڑھا اور ہر بار قدم قدم پر تشنگی اور ناتمامی کا احساس ہوا اور حسرت پیدا ہوئی کہ کاش مولانا یہ بھی لکھ جاتے وہ بھی لکھ جاتے۔ لیکن ظاہر ہے انھوں نے یہ خط میرے منصوبے کی تکمیل کے لیے تو لکھا نہیں۔ معمولی خیر و عافیت اور دیگر حالات کی اطلاع کیلئے لکھا

مولانا کا خط پڑھنے کے بعد میں نے ابوسفیان صاحب کا خط پڑھا مجھے یہ دیکھ کر خوشی اور طمانیت حاصل ہوئی کہ انھوں نے اس خط کے بارے میں جو الفاظ لکھے ہیں ان سے میرے خیال کی تائید ہوتی ہے، میں چاہتا ہوں کہ ان کے الفاظ یہاں نقل کر دوں۔

"مولانا فراہی کا خط اپنے والد محترم کے نام جب کہ وہ لاہور مولانا فیض الحسن صاحب کے یہاں پڑھنے گئے تھے۔"[1]

ابوسفیان صاحب نے یہ نہیں بتایا کہ انھیں یہ خط کہاں سے کب ملا۔

اب ہم اصل خط، اس کے مندرجات اور بعض ان نکات اور سوالات کا جائزہ لیں گے جن میں ابہام ہے یا جو وضاحت طلب ہیں، خط میں مکتوب نگار کا نام عبدالحمید ہے، یہ معلوم ہے کہ مولانا فراہی کے دو نام تھے حمید الدین اور عبدالحمید اگرچہ وقت اور حالات کے ساتھ ان کے استعمال میں فرق اور تبدیلی واقع ہوتی رہی، لیکن ان کی زندگی میں ان دونوں ہی ناموں کا ذکر کثرت سے ملتا ہے، ابتدائی زندگی میں صرف عبدالحمید، اور بعد کے ادوار میں عبدالحمید اور حمید الدین دونوں کا ثبوت دستاویزات سے ملتا ہے، ہم نے اپنی کتاب میں نام کے مسئلے پر تفصیل سے بحث کی ہے، ہم نے اس سے پہلے تک کے دریافت شدہ خطوط کی بنیاد پر یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ مولانا کے اپنے خطوط میں ان کا نام بلا استثنا حمید الدین لکھا ہوا ملتا ہے، اگر اس خط کی دریافت کے بعد ہمیں اپنے اس بیان پر نظر ثانی کرنی ہوگی۔ یہ مولانا کا سب سے قدیم خط ہے، جو ہمیں اب تک مل سکا ہے، اس خط سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کے لکھنے کے زمانے تک دونوں بھائیوں کے نام عبدالحمید اور عبدالرشید تھے جو بعد میں حمید الدین اور رشید الدین ہو گئے۔ اس کے اسباب سے بھی ہم نے اپنے مقالے میں بحث کی ہے۔" نام کی بحث میں یہ خط غیر معمولی طور پر اس لحاظ سے خصوصی اہمیت کا حامل ہے

[1] ابوسفیان اصلاحی، خط مورخہ نومبر ۱۹۸۵ء، قلمی۔

مولانا کے اپنے خط میں ان کے اپنے قلم سے ان کا نام عبدالحمید اور چھوٹے بھائی کا نام عبدالرشید لکھا گیا ہے، جب کہ اس زمانے تک حمید الدین اور رشید الدین کا ذکر بھولے سے کہیں ایک جگہ بھی نظر نہیں آیا۔ نام کے علاوہ خط کے مضمون میں اور بھی جتنی باتیں ہیں وہ سب کی سب مولانا فراہی پر منطبق ہوتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ خط میں جن تین اشخاص کا ذکر نام کی صراحت کے ساتھ ہے، وہ تینوں مولانا کے عزیز اور رشتہ دار ہیں، عبدالرشید مولانا کے بھائی اور صدر الدین ان کی پھوپھی زاد بہن کے لڑکے ہیں، مرزا صدر الدین اور پھوپھی زاد بہن کا ذکر مولانا کے حالات میں اکثر آتا ہے، مولانا کے اپنی کوئی بہن نہیں تھیں، مولانا ان ہی کو بہن سمجھتے تھے، ان ہی کی وفات پر ایک پر درد اور الم انگیز مرثیہ لکھا تھا، جو موجودہ دیوان میں ہے، جس سے اکثر لوگ یہ سمجھنے لگے کہ مولانا کے کوئی بہن بھی تھیں، اس خط کے آخر میں "ہمشیرہ صاحبہ" سے وہی مراد ہیں اور چونکہ وہ حقیقی بہن نہیں تھیں، اس لیے ان کی والدہ کا ذکر "والدہ شان" کے الفاظ سے کیا، مرزا صدر الدین اور مولانا کے والد کے درمیان جائداد کا مقدمہ چلا تھا، جس میں مولانا نے ثالث کا فریضہ انجام دیا، اور فیصلہ اپنے والد کے خلاف دے دیا، یہ وہی صدر الدین ہیں، مولوی محمد شبلی سے مراد علامہ شبلی نعمانیؒ ہیں، جو ایک نہیں متعدد واسطوں سے مولانا کے رشتہ دار بھی تھے، اور مولانا نے ان سے پڑھا بھی تھا۔

اس خط سے مولانا کے قیام لاہور سے متعلق کئی مفید باتوں کا پہلی بار علم ہوتا ہے، لاہور میں مولانا کی رہائش مولانا فیض الحسن صاحب کے مکان کے اوپر والے حصے میں تھی جس میں مولانا شبلیؒ بھی جب لاہور آئے تھے کچھ عرصہ رہے تھے، مولانا کا اس کا کرایہ ڈیڑھ روپیہ ماہوار ادا کرنا پڑتا تھا، یہ نہیں معلوم کہ مولانا سہارنپوری خود بھی کرایہ دار کی حیثیت سے رہتے تھے، یا یہ مکان ان ہی کا تھا، سہارنپوری صاحب کے بارے میں بعض دوسرے ذرائع سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھاٹی گیٹ میں رہتے تھے، مولانا فراہی نے استاد الادب سے جو کتابیں پڑھیں ان میں سے دو کا ذکر اس خط میں آیا ہے، صدرا اور حماسہ، خط کے مضمون سے مترشح

ہوتا ہے کہ ان کتابوں سے شروعات نہیں ہوئی۔ ان سے پہلے بھی کچھ کتابیں پڑھی ہوں گی، اور ان کے بعد بھی، ادب جاہلی مولانا سہارنپوری کا خاص میدان تھا، مولانا فراہی کے ہاں کلام جاہلیت کے ساتھ جو اعتنا اور شغف نظر آتا ہے، اس میں استاد کے فیض کا حصہ یقیناً نمایاں رہا ہوگا، اس خط سے ایک نئی بات یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ مولانا فراہی نے انگریزی کا آغاز لاہور میں کیا اور اپنے والد کے حسب ہدایت، اس لحاظ سے لاہور ایک طرف مولانا کی عربی تعلیم کی حد اختتام ہے، تو دوسری طرف انگریزی تعلیم کا نقطۂ آغاز بھی، مولانا سید سلیمان ندویؒ نے مولانا کے حالات میں لکھا ہے کہ انھوں نے نجی طور پر انگریزی پڑھ کر کرنل گنج ہائی اسکول الہ آباد میں داخلہ لیا۵۵۔ اس خط سے معلوم ہوا کہ اس نجی تعلیم کا پہلا مرحلہ لاہور میں طے ہوا، اس خط میں تاریخ کا ذکر نہیں، لیکن اندازاً مولانا ۸۲ - ۱۸۸۰ میں لاہور گئے ہوں گے۔ ۱۸۸۶ غالباً مولانا سہارنپوری کا سال وفات ہے۔ اس لحاظ سے یہ خط تقریباً سو سال پرانا ہو چکا ہے۔ اس خط کی ظاہری حالت ہر اعتبار سے اس کی قدامت کی غماز ہے، اس خط کا خط البتہ اس کے خلاف شہادت دیتا ہے کہ یہ مولانا فراہی کا لکھا ہوا ہے، اس میں وہ پختگی اور خوبصورتی نہیں جو مولانا کی تحریر کا خاصہ تھا، اس کی ۔۔۔ وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ ہماری نگاہیں جس خط کی عادی ہیں، اس کا تعلق بہت بعد کی زندگی سے ہے، اور اس خط کا تعلق ابتدائی زندگی سے جو صحیح معنوں میں طالب علمی کا زمانہ تھا۔ لیکن خط اتنا خراب بھی نہیں۔ نقش اول میں نقش ثانی کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے۔

---

۵۵ یاد رفتگاں۔ ص ۱۳۱۔

وفیات

آہ ڈاکٹر سید محمد عبد اللہ

از جناب شیخ نذیر حسین صاحب مدیر اردو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام پنجاب یونیورسٹی لاہور

پاکستان کے ممتاز عالم، نامور ادیب اور معروف نقاد اور اردو زبان کے محسن ڈاکٹر سید محمد عبد اللہ نے ۱۴ اگست ۱۹۸۶ء کو اسّی برس کی عمر میں اس عالم فانی کو الوداع کہا۔ ان کی وفات سے پنجاب یونیورسٹی اور اورینٹل کالج کی وہ علمی روایت اختتام کو پہنچی جس کا آغاز مولوی فیض الحسن[1] سہارنپوری اور مفتی محمد عبد اللہ[2] ٹونکی کی علم پرور مساعی سے ہوا تھا اور اس کو مولوی محمد شفیع، سید اولاد حسین شادان بلگرامی رام پوری، مولوی عبد العزیز میمن اور حافظ محمود شیرانی مرحومین نے پروان چڑھایا تھا۔

ڈاکٹر سید عبد اللہ ۱۹۰۶ء میں قصبہ منگلور تحصیل و ضلع مانسہرہ صوبہ سرحد میں پیدا ہوئے، وہ گورنمنٹ ہائی اسکول ایبٹ آباد کی نویں جماعت میں زیر تعلیم تھے کہ تحریک خلافت کا غلغلہ بلند ہوا۔ اور وہ علی گڑھ جاکر جامعہ ملیہ اسلامیہ میں داخل ہوگئے، علی گڑھ میں ان کا دل نہ لگا تو چند ماہ کے بعد لاہور چلے آئے اور اہل حدیث کے مشہور مدرسہ مسجد چینیاں

[1] مولوی فیض الحسن سہارنپوری (م ۱۸۸۷ء)، عربی زبان کے مشہور ادیب و شاعر، دیوان الحماسہ اور سبعہ معلقہ کے نامور شارح

[2] مفتی محمد عبد اللہ ٹونکی (م ۱۹۳۰ء)، اورینٹل کالج سے ریٹائر ہوکر پہلے دار العلوم ندوۃ العلماء اور پھر کلکتہ مدرسہ میں مدرس رہے، اردو میں اقلیدس کا ترجمہ اور دیوان ابو العتاہیہ کی شرح ان کی علمی یادگاریں ہیں۔

والی میں درس نظامی کی تحصیل میں مصروف ہوگئے، اور کافیہ اور مشکوٰۃ تک یہیں تعلیم پائی۔ اس اثنا میں وہ قید بھی ہوئے، پھر اورینٹل کالج کی مولوی عالم کلاس میں جا شامل ہوئے، جہاں ان کے مشہور استاد مولوی عبد العزیز میمن سبعہ معلقہ اور ادب کی دوسری کتابیں پڑھاتے تھے، ساتھ ہی وہ مولوی احمد علی صاحب (انجمن خدام الدین، لاہور) کے درس قرآن میں شریک رہتے تھے، مرحوم سے انھوں نے حجۃ اللہ البالغہ پڑھی، اور غالباً صحیح مسلم بھی۔ مولوی احمد علی صاحب کی دینی خدمات اور ان کی زاہدانہ زندگی کا اثر ان پر آخر آخر تک رہا۔ فرماتے تھے کہ ایک دفعہ مولوی صاحب نے اپنا ہاتھ میرے سینے پر رکھا تھا، اور اس کی ٹھنڈک آج تک محسوس ہو رہی ہے۔ ۱۹۲۳ء میں منشی فاضل، ۱۹۲۵ء میں ایم۔ اے (فارسی)، ۱۹۳۲ء میں ایم۔ اے (عربی)، کے امتحانات پرائیوٹ طور پر پاس کئے اور ۱۹۳۵ء میں ڈی لٹ کی ڈگری حاصل کی۔ سید صاحب نے مختلف حیثیتوں میں ساٹھ برس تک پنجاب یونیورسٹی کی لگاتار خدمت کی جو ایک شاندار ریکارڈ ہے، وہ ۱۹۲۶ء میں عربی فارسی مخطوطات کے فہرست نگار مقرر ہوئے، ۱۹۳۴ء میں شعبۂ عربی پنجاب یونیورسٹی لائبریری کے نگراں ہوئے، جہاں پانچ برس تک کام کرتے رہے۔ اس زمانے میں یونیورسٹی لائبریری کے بیشتر فارسی اور عربی مخطوطات ان کے مطالعے میں آئے، جن پر ان کے حواشی ثبت ہیں، ۱۹۳۹ء میں وہ جونیر لیکچرر اورینٹل کالج مقرر ہوئے۔ تقسیم ہند کے پرآشوب زمانے میں انھوں نے جس طرح پنجاب یونیورسٹی لائبریری کی حفاظت کی وہ ان کے احساس ذمہ داری کی بہترین مثال ہے۔ ۱۹۵۳ء میں یونیورسٹی پروفیسر اردو ہوئے اور ۱۹۵۴ء-۱۹۶۶ء پرنسپل رہے، اور ۱۹۶۶ء میں اردو دائرۂ معارف اسلامیہ کے صدر شعبہ متعین ہوئے، اور اپنی وفات اگست ۱۹۸۶ء تک فائز رہے۔

وہ ۱۲ مارچ ۱۹۸۶ء کو دفتر میں کام کر رہے تھے، کہ ان پر اچانک فالج کا حملہ ہوا اور

وہ ہسپتال پہنچائے گئے، تین ہفتوں کے بعد تھوڑا افاقہ ہوا تو وہ ۱۰ر اپریل ۱۹۸۶ء کو گھر آگئے، علالت کے ایام میں گورنر پنجاب مخدوم محمد سید سجاد حسین قریشی دو دفعہ ان کی عیادت کو آئے، اور علاج معالجہ کے اخراجات کے لیے ایک لاکھ روپیے کا چیک پیش کیا۔ صدر پاکستان جناب جنرل ضیاء الحق صاحب نے اپنا خصوصی معالج بھیجا، لیکن وہ بہترین طبی امداد کے باوجود ۱۴ر اگست ۱۹۸۶ء کو حج بیت اللہ کے دن اپنے خالق حقیقی سے جا ملے، جب میدان عرفات لبیک اللّٰہم لبیک کی صداؤں سے گونج رہا تھا،

ڈاکٹر عبداللہ کی زندگی مسلسل جد و جہد اور عمل پیہم سے عبارت تھی، پڑھنا اور لکھنا ان کا اوڑھنا اور بچھونا تھا۔ انھوں نے جس کام میں ہاتھ ڈالا اس کو پورا کرکے دکھایا، مخالفوں کی مخالفت کی انھوں نے کبھی پروا نہیں کی۔ وہ صبر و سکون سے اپنے کام میں لگے رہتے تھے اور ان کے حریف بالآخر میدان سے بھاگ جاتے، وہ نہ کبھی تھکے نہ مایوس ہوئے۔

سید صاحب وسیع النظر، وسیع الخیال اور وسیع القلب تھے، ان کا حلقۂ احباب بڑا وسیع تھا، مساجد کے خطیب سے لے کر صحافی، وکیل اور بڑے بڑے نامور ادیب و دانشور اور اعلیٰ عہدہ داران حکومت ان کی بزم ادب میں بلا روک ٹوک اور بلا تکلف آتے رہتے تھے، انکی مجلسیں بزرگوں کے سبق آموز حالات، قومی تحریکات کے ذکر، سیاسی حالات پر لطیف تبصرے اور لطائف و ظرائف اور شعر و شاعری کے تذکرے سے معمور رہتی تھیں، سید صاحب کو عربی و فارسی اور اردو کے ہزاروں اشعار یاد تھے، ان کی کتاب اخلاق کا سنہری باب ان کی بردباری، معتدل مزاجی، نرم خوئی، اور خندہ روئی ہے، اگرچہ وہ عقائد اور اعمال میں اکابر علمائے دیوبند کے ہم خیال تھے، لیکن ان کے شیعہ، سنی، اہل حدیث اور بریلوی علماء سے بھی یکساں تعلقات تھے، وہ غلو اور شدت پسندی سے نفور تھے، اور کہا کرتے تھے کہ میرا مسلک، مسلکِ محبت ہے، وہ

بزرگوں کے ادب شناس تھے، اسی میانہ روی کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے کسی دینی یا سیاسی رہنما کی تنقیص یا توہین نہیں کی، وہ عوام و خواص میں مقبول اور ایوان حکومت میں معزز و محترم تھے، حکومت پاکستان نے ان کو کئی اعزازات سے نوازا ہے۔

سید صاحب کی قوت تدریس حیرت انگیز تھی، وہ ایک دن میں مختلف کلاسوں، یعنی ایم۔ اے (عربی) ایم۔ اے (فارسی) اور ایم۔ اے (اردو) کو پڑھا دیتے تھے، وہ اپنے شاگردوں سے بڑی محبت اور شفقت سے پیش آتے تھے، ہونہار اور محنتی طلبہ جلد ہی ان کی توجہ کا مرکز بن جاتے تھے، غریبوں اور ضرورت مندوں کی مدد کے لئے ہر وقت تیار رہتے تھے، ان کی سعی اور سفارش سے پچاسوں بے روزگار نوجوانوں نے ملازمت حاصل کی۔

سید صاحب اردو زبان کے شیدائی و فدائی تھے۔ انھوں نے اپنے جسم و جان اور صحت کو اردو کی ترویج اور اشاعت کے لیے وقف کر رکھا تھا، فرمایا کرتے تھے کہ پاکستان دو چیزیں متحد رکھ سکتی ہیں، اسلام اور اردو زبان، اردو کو قومی زبان بنانے کے لئے انھوں نے جلسے کئے، جلوس نکالے اور کانفرنسیں منعقد کیں، بازاروں میں جا کر دوکانداروں کو اردو میں سائن بورڈ لکھوانے کی تاکید اور چوراہوں میں کھڑے ہو کر کار والوں کو روک کر پلیٹ کا نمبر اردو میں لکھوانے کی تلقین کی۔ اردو سے غیر معمولی شغف کی بنا پر انھیں بعض اوقات ارباب اقتدار کی ناراضی اور برہمی کا بھی سامنا کرنا پڑا، لیکن ان کے پائے استقلال میں لغزش نہ آئی، فرمایا کرتے تھے کہ عربی رسم الخط ایک قسم کا شارٹ ہینڈ اور اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے۔ اور اتحاد اسلامی کی اساس ہے، وہ مسلم ممالک جنھوں نے عربی فارسی رسم الخط کو چھوڑ کر کوئی دوسرا رسم الخط اختیار کر لیا ہے۔ اسلام کی عالمگیر برادری سے منقطع اور اسلام کے چودہ سو سالہ علمی ورثے کے فیوض و برکات سے محروم ہو گئے ہیں، اس بارے میں وہ جدید ترکی کی مثال دیا کرتے تھے،

اردو زبان سے غیر معمولی شغف کا دوسرا مظہر مغربی پاکستان اردو اکیڈمی کا قیام ہے۔ اس کا مقصد سائنسی علوم کو اردو میں منتقل کرنا ہے، چنانچہ سید صاحب کے دور نظامت میں اردو اکیڈمی نے مختلف سائنسی موضوعات، جوہری توانائی، نباتیات، حیوانیات، نفسیات اور نظریۂ اضافیت پر ساٹھ کتابیں شائع کر کے اردو زبان کو جدید سائنسی معلومات سے مالا مال کر دیا ہے۔

تصانیف | سید صاحب علمی اور تعلیمی زندگی میں مولوی محمد شفیع اور حافظ محمود شیرانی سے زیادہ متاثر اور عمر بھر ان دونوں کے علمی نظریات اور روایات کے امین اور علمبردار رہے، انھوں نے تیس بتیس [۳۰ ۳۲] کے قریب کتابیں لکھیں، جن میں اہم ترین یہ ہیں۔

۱۔ تحقیقی کتابیں | (۱) لطائف نامۂ فخری (میر علی شیر کی کتاب مجالس النفائس، (ترکی) کا فارسی ترجمہ، جو فخری بن امیری نے کیا تھا) اور سید صاحب کی تحقیق اور تحشیہ سے اورینٹل کالج میگزین میں شائع ہوتا رہا (۲) تذکرہ مردم دیدہ (فارسی) عبدالحکیم لاہوری نے معاصر شعرائے فارسی کا تذکرہ مرتب کیا تھا، جو سید صاحب نے تصحیح کے بعد چھپوایا (۳) نوادر الالفاظ، ہندوستان کے آخری دور کے عظیم محقق سراج الدین علی خان آرزو کی فارسی میں اردو زبان کی لغت جو سید صاحب نے متعدد قلمی نسخوں سے مقابلے کے بعد ایڈیٹ کی اور انجمن ترقی اردو کراچی نے شائع کی۔

۲۔ فکری کتابیں | مباحث (طبع دوم) (مختلف علمی، ادبی اور تاریخی مضامین کا مجموعہ جس کے دو [۲] ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ (۲) ولی سے اقبال تک (اردو کے نامور شعراء پر مضامین) (۳) نقد میر۔ خدائے سخن میر تقی میر کے حالات اور اس کی شاعری پر تبصرہ (۴) وجہی سے عبدالحق تک، (اردو نثر کی تاریخ اور مشہور نثر نگاروں کی تخلیقات کا ناقدانہ جائزہ) کتاب کے

ایک باب بعنوان "ابوالکلام آزاد۔ امام عشق و جنون" کے تحت مولانا آزاد کی شخصی اور مزاجی کیفیات کا تجزیہ جس عمدگی سے کیا ہے، اور ان کے علم و فضل کے جلوہ ہائے صد رنگ کی جس چابکدستی اور خوبصورتی سے مصوری کی ہے وہ خاصے کی چیز ہے اور انشائے عالیہ کا بہترین نمونہ ہے (۵) اشارات تنقید (نقد الادب کی تاریخ، یورپ کے تنقید نگاروں اور اسلامی دور کی تنقید کا تذکرہ، تنقید کے دور جدید اور اس کے مختلف تصورات کا بیان) (۶) سرسید احمد خان اور ان کے رفقاء کی نثر کا فکری جائزہ (طبع چہارم لاہور (سرسید اور ان کے نامور رفقاء کی علمی و تصنیفی سرگرمیوں کا جائزہ، اردو ادب پر ان کے اثرات و احسانات کا تذکرہ) (۷) ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ، طبع دوم انجمن ترقی ادب، لاہور، (ہندوؤں میں فارسی زبان کی ترویج و اشاعت کی تاریخ، فارسی گو ہندو شاعروں کا تذکرہ، ہندو فضلا کی لکھی ہوئی تاریخوں، تذکروں، کتب نصاب اور قواعد و لغت کی تصانیف کا تفصیلی تعارف، یہ وقیع کتاب ان کے نام اور کام کو ہمیشہ زندہ رکھے گی، یہ کتاب سید صاحب نے سب سے پہلے انگریزی میں لکھی تھی، جس پر پنجاب یونیورسٹی نے انھیں ڈی لٹ کی ڈگری دی تھی، بعد میں اس کا اردو ترجمہ انجمن ترقی اردو دہلی نے شائع کیا۔

. . . .

(۸) سہل اقبال (۹) مسائل اقبال (علامہ اقبال کی شاعری کے مختلف موضوعات پر مضامین کا مجموعہ (۱۰) فارسی زبان و ادب (طبع مجلس ترقی ادب، لاہور) فارسی شاعری کے مختلف ادوار کی تاریخ، مشاہیر شعرائے فارسی کا تذکرہ، نئی فارسی شاعری کی خصوصیات، ایران جدید کی علمی و ادبی سرگرمیوں کا ناقدانہ جائزہ)

۱۱۔ سید عبداللہ صاحب نے پنجاب یونیورسٹی لائبریری کی عربی، فارسی اردو وغیرہ کی قلمی کتابوں کی مشرح فہرست بھی مرتب کی جو پہلے انگریزی اور پھر اردو میں منتقل ہوئی، مذکورہ کتابوں کے علاوہ سید صاحب نے دو ڈھائی سو مضامین مختلف ادبی، دینی اور قومی موضوعات پر لکھے ہیں،

ستر کے قریب کتابوں پر ان کے مقدمے اور تبصرے ہیں، انھوں نے کئی کتابوں کے مسودے بھی چھوڑے ہیں۔ جن میں عزیز و محترم قابل ذکر ہے، اس میں بزرگوں، دوستوں اور عزیزوں کے متعلق شخصی تاثرات ہیں۔

ڈاکٹر سید محمد عبداللہ کی علمی و تصنیفی زندگی کا زندۂ جاوید کارنامہ اردو دائرۂ معارف اسلامیہ کی تکمیل ہے۔ ان کے پیش رو مولوی محمد شفیع مرحوم کے زمانے میں اگرچہ انگریزی انسائیکلو پیڈیا آف اسلام (لائیڈن) کی تمام جلدوں کا منقح ترجمہ ہو چکا تھا، اور اس کی دو جلدیں بھی شایع ہو چکی ہیں، لیکن اس کی حقیقی تکمیل کا سہرا ڈاکٹر سید عبداللہ کے سر ہے، انھوں نے اس میں دینی اور قومی روح پھونک دی ہے، خود بھی ایک سو کے قریب مقالات لکھے اور بیرونی فضلا سے بھی سینکڑوں مقالات لکھوا کر اس کو مستقل حیثیت عطا کر دی ہے، اسی زمانے میں عربی، فارسی اور ترکی انسائیکلو پیڈیا کے بعض اجزا بھی اشاعت پذیر ہوئے تھے، لیکن پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکے اور ان کی حکومتوں نے اس بھاری پتھر کو چوم کر رکھ دیا تھا، عربی انسائیکلو پیڈیا، جس میں مصر کے مشہور محقق عالم قاضی احمد محمد شاکر کے مختصر سے ذیلی حواشی ہیں، حرف "ص" سے آگے نہ بڑھ سکا۔

اس کے مقابلے میں اردو دائرۂ معارف اسلامیہ کی بیس جلدیں شایع ہو چکی ہیں، اور دو زیر طباعت ہیں، جن کے بعد اصل کام دو ڈھائی سالوں میں مکمل ہو جائے گا۔ انشاءاللہ تعالے کویت اور جامع ازہر نے اس کو عربی میں منتقل کرنے کی اجازت طلب کی ہے، سید صاحب نے اپنے پیچھے سینکڑوں شاگرد چھوڑے ہیں، جو ان کی فروزاں کی ہوئی شمع علم و عرفان کی روشنی میں اپنا علمی سفر طے کر رہے ہیں، دعا ہے کہ اللہ تعالے اپنے دین و ادب کی خدمت کے صدقے میں مرحوم کے درجات بلند کرے، اور انھیں جنت الفردوس میں جگہ دے۔

بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں۔

مطبوعات جدیدہ

آداب المریدین:- از حضرت ضیاء الدین سہروردیؒ مترجمہ مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ، تقطیع کلاں، کاغذ، کتابت و طباعت صاف، صفحات ۔ قیمت تحریر نہیں، ناشر مولانا محمد شمیم صاحب مدرسۂ صولتیہ مکہ معظمہ، سعودی عرب۔

شیخ المشائخ حضرت ضیاء الدین ابونجیب عبدالقاہر بن عبداللہ سہروردیؒ چھٹی صدی ہجری کے کبار صوفیہ میں تھے، ان ہی کے برادر زادہ اور خلیفہ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ تصوف کے مشہور سلسلۂ سہروردیہ کے بانی تھے، شیخ المشائخ کی متعدد تصنیفات میں آداب المریدین زیادہ اہم اور مشہور رہی ہے، جو دراصل طالبین و سالکین کے لیے ایک دستور العمل ہے، اس میں اولیاء اللہ کے عقائد، اعمال، اشغال، ظاہری و باطنی آداب، طور طریقے، اطلاقات اور اصطلاحات اس لیے قلمبند کئے گئے ہیں، تاکہ سلوک و تصوف کے طریقہ کو اختیار کرنے والے انھیں مشعل راہ بنائیں، مصنف نے اس راہ کی مضر اور خطرناک باتیں بھی بیان کی ہیں تاکہ طالبین ان سے بچ سکیں، جابجا اس کی تلقین ہے کہ سالک کو اصلی اور حقیقی صوفیہ سے تعلق پیدا کرنا اور تصوف کے نام پر مکر و فریب کرنے والوں سے متنفر رہنا چاہیے، یہ کتاب کئی فصلوں میں منقسم ہے، پہلے صوفیہ کے عقائد بیان کئے گئے ہیں، فقر، تصوف اور زہد کی حقیقت واضح کی گئی ہے، حلال کمائی اور دین کے احکام و فروع کو معلوم کرنے کی تلقین اور مذہب کے ظاہر و باطن کا تذکرہ کیا ہے، صوفیہ کے اخلاق، احوال، مقامات، بول چال کے آداب الگ الگ فصلوں میں تحریر ہیں، اس کا بھی ذکر ہے کہ طالبین کو

کن لوگوں کی صحبت اختیار کرنی چاہئے اور کن لوگوں کی ہم نشینی ترک کرنی چاہیئے، ایک فصل میں لکھا ہے کہ صوفیہ سے حال کے غلبے، سکر کی شدت اور وجد کے جوش میں جو خلاف شرع باتیں منقول ہیں، ان کو نہ قبول کرنا چاہئے، پھر ایک ایک فصل میں مشائخ کے لباس، طعام، منام، سماع، نکاح، سوال، مرض، موت اور رجا کے موقع کے آداب بیان کئے ہیں، اور آخر میں رخصتوں پر عمل کرنے میں ان کے اصول و آداب کا ذکر ہے، ان سب امور کے ضمن میں گوناگوں صوفیانہ اسرار، عارفانہ حقائق اور حکیمانہ باتیں بھی مذکور ہیں، ان کے علاوہ بعض آیات و احادیث سے مفید نکات بھی پیش کئے ہیں، حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی کے ایماء سے مولانا رحمت اللہ کیرانوی نے تصوف و اخلاق کی اس مشہور عربی کتاب کا ۱۲۸۵ھ میں خانہ کعبہ میں اردو ترجمہ کیا تھا، ؤرد عیسائیت میں اپنی مفید تصنیفات اور مدرسہ صولتیہ مکہ معظمہ کے بانی ہونے کی وجہ سے خاص شہرت و امتیاز کے حامل ہیں، یہ ترجمہ عرصہ ہوا چھپا تھا، مگر اب نایاب تھا، اس لئے مدرسۂ صولتیہ مکہ معظمہ کے موجودہ ناظم مولانا محمد شمیم صاحب نے قدیم اڈیشن کا عکس آفسٹ میں شائع کیا ہے، جس طرح ان کی ذات گرامی مدرسہ صولتیہ کی نگرانی کی وجہ سے دینی برکات اور تعلیمی فیوض کا سرچشمہ بنی ہوئی ہے، اسی طرح سے امید ہے کہ ان کی مساعی جمیلہ سے جو یہ کتاب پھر لوگوں کے ہاتھوں میں آگئی ہے، اس سے وہ مستفید ہوں گے اور انکے رفع درجات و مراتب اور مدرسہ کی فلاح و بہبود کے لیے دعاگو ہوں گے۔

داستان حیات سید میر قاسم } مرتبہ جناب عبدالرحمٰن کوندو صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۵۰۷ مجلد، قیمت ساٹھ روپیے

پتے (۱) کتب خانہ عزیزیہ، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی ۶ (۲) عظیم بکڈپو، دیوبند، یو۔پی (۳) کالج بک شاپ۔ بارہ مولہ، کشمیر۔

یہ کتاب کشمیر کے سابق وزیر اعلیٰ اور مرکزی وزیر جناب سید میر قاسم کی آپ بیتی ہے، تقسیم کے بعد

کشمیر کے سیاسی افق پر جو شخصیتیں زیادہ نمایاں ہوئیں ان میں ایک یہ بھی ہیں، وہ علی گڑھ میں تعلیم مکمل کرکے ۱۹۴۶ء میں کشمیر لوٹے تو اس وقت "کشمیر چھوڑ دو" تحریک کا زور تھا، اس میں انھوں نے بھی حصہ لیا، اس کے بعد سیاست سے ان کو غیر معمولی دلچسپی ہوگئی، اور کشمیری سیاست کے ہر موڑ اور ہر مرحلہ پر وہ نظر آئے، وہ پہلے نیشنل کانفرنس کے سرگرم ممبر ہوئے پھر جمہوری نیشنل کانفرنس قائم کی جس کو بعد میں نیشنل کانفرنس میں ضم کر دیا، کشمیر میں انڈین نیشنل کانگریس کے قیام میں بھی وہ پیش پیش رہے، مختلف کشمیری وزارتوں میں شامل ہوئے، اور اختلاف کی وجہ سے ان سے علحدہ بھی ہوئے۔ خود ان کی سرکردگی میں بھی یہاں حکومت قائم ہوئی، وہ مرکزی وزارت اور تنظیم میں بھی اعلیٰ منصب پر فائز ہوئے، جنتا حکومت کے زمانہ میں مسز اندرا گاندھی کے وفادار رہے، مگر ان کے دوبارہ برسر اقتدار آنے کے بعد کانگریس سے الگ ہوگئے، یہ کتاب جناب میر قاسم کی ان سرگرمیوں اور گذشتہ نصف صدی کی کشمیری سیاست کے نشیب و فراز کی دلچسپ روداد ہے، اس میں پہلے ان کے خاندان، ولادت، وطن اور تعلیم کی تفصیل درج ہے، اس حصہ میں ان کے خاندان و وطن کے بعض ممتاز لوگوں کے مختصر حالات بھی دئے گئے ہیں، پھر کشمیر کی سیاست میں ان کی سرگرمی کی داستان شروع ہوتی ہے، اس کی ابتدا کشمیر کے الحاق، اس پر قبائلی حملہ اور اس کے بعد کی پیدا ہونے والی پیچیدہ سیاسی صورت حال کے ذکر سے ہوتی ہے، اس کے ضمن میں شیخ عبداللہ کی تشکیل حکومت آئین سازی کے مختلف مراحل، اس کی مشکلات اور اس میں تعطل کا ذکر بھی ہے، یہ سلسلہ شیخ عبداللہ کے موقف کی تبدیلی، دلی اور کشمیر کے لیڈروں سے ان کے اختلافات، معاہدہ دلی، جموں ایجی ٹیشن، شیخ کی گرفتاری اور بخشی غلام محمد کی وزارت کے قیام کے تذکرہ پر ختم ہوا ہے، بخشی غلام محمد کی وزارت میں اپنی اور خواجہ غلام محمد صادق کی شمولیت اور اس سے علحدگی کے ذکر میں ان سے اپنے اور خواجہ صاحب کے اختلافات کی وضاحت کے علاوہ اس دور کی بدعنوانیوں اور شیخ عبداللہ اور ان کے حامیوں پر

ظلم و تشدد کا تذکرہ بھی ہے، صادق صاحب کے زمانہ میں شیخ عبداللہ کی رہائی، پاکستان اور حج کے ان کے سفر اور چو این لائی سے ان کی ملاقات، ۱۹۶۵ء کی ہند پاک جنگ، حکومت ہند کی جانب سے یو۔این۔او میں اپنی نمایندگی اور اندرا گاندھی کے وزیر اعظم ہونے، صادق صاحب سے اپنے اختلاف، مشرق وسطیٰ اور روس کے سفر اور ۱۹۷۱ء کی ہند پاک جنگ وغیرہ کی سرگذشت بیان کی ہے، اپنے دور حکومت میں ۱۹۷۵ء کے کشمیر سمجھوتہ کے نتیجہ میں شیخ صاحب کو رضا کارانہ اقتدار منتقل کر دینے اور سمجھوتہ کے شرائط کے متعلق شیخ عبداللہ اور مسز اندرا گاندھی کے اختلاف کا ذکر ہے، پھر مرکزی حکومت میں ان کے شامل ہونے اور ۱۹۸۳ء کے انتخابات نیز شیخ عبداللہ کی وفات، اور اپنے اور مسز اندرا گاندھی کے اختلاف اور کانگریس سے اپنے استعفا کی تفصیل درج کی ہے، اور سری نگر اور کلکتہ میں اپوزیشن پارٹیوں کے ... جلسوں کی روداد، ان میں اپنی شرکت نیز آیندہ کے اپنے عزائم بیان کئے ہیں، سرگزشت کے خاتمہ کے بعد فاروق عبداللہ کی وزارت کی غیر آئینی برطرفی کے بارہ میں اپنے اور دوسروں کے تاثرات پیش کئے ہیں، آخر میں تین ۳ ضمیمے ہیں، ایک میں میر صاحب کی وہ تقریر درج ہے، جو ۱۹۶۵ء میں انھوں نے اقوام متحدہ میں اس وقت کے پاکستانی وزیر خارجہ مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کے جواب میں کی تھی، دوسرے میں اپنے اور مسز اندرا گاندھی کے وہ خطوط درج ہیں جو ان سے اختلاف کے زمانہ میں لکھے گئے تھے، تیسرے ضمیمہ میں اپنی اہلیہ اور اولاد کا مختصر تذکرہ ہے، اس کتاب میں بعض اور سیاسی رہنماؤں کے درمیان خط و کتابت کی تفصیل بھی دی گئی ہے، جناب میر قاسم نے اپنے مشاہدات و تاثرات کی تصدیق و تائید کے لیے اخبار، رسالوں اور کتابوں کے اقتباسات اور بعض قومی رہنماؤں کے خیالات بھی نقل کئے ہیں، اس طرح یہ کتاب محض میر قاسم کی سرگذشت ہی نہیں ہے، بلکہ گذشتہ نصف صدی کے واقعات و حالات اور کشمیری سیاست کے اتار چڑھاؤ کی ایک تاریخی دستاویز بھی ہے، اس لئے مستند ہے کہ وہ ان واقعات کے عینی شاہد اور ان میں عملاً شریک بھی رہے، میر قاسم نے واقعات کو بے کم و کاست اور رنگ آمیزی کے بغیر بیان کیا ہے۔ اس کتاب میں اکثر اشخاص کے ذریعہ

تبصرہ اور متوازن انداز میں اظہار خیال بھی کیا گیا ہے، مصنف نے بعض حالات و مسائل پر جو بحث و تبصرہ کیا ہے، اس سے ان کی سیاسی سوجھ بوجھ، معاملہ فہمی، قومی و سیاسی مسائل میں معتدل طرز فکر اور سلجھے انداز کا پتہ چلتا ہے، ہندوستان سے کشمیر کے الحاق کو وہ اٹل سمجھتے تھے، انھوں نے یو۔این۔او میں اس کی وکالت اور پاکستانی نظریہ کی تردید بھی کی تھی، لیکن اس سلسلہ کے بعض امور خصوصاً شیخ عبداللہ کے معاملہ میں ہندوستانی لیڈروں کے طریقہ کار سے ان کو اختلاف تھا، وہ شیخ کے بدلے ہوئے موقف کا ذمہ دار بھی ان ہی لیڈروں کو بتاتے ہیں، شیخ عبداللہ کے نقطۂ نظر سے اختلاف کے باوجود انھیں یہ تسلیم تھا کہ عوامی سطح پر ان کا مقابلہ اور طاقت سے ان کو دبانا ناممکن ہے، اسی لیے وہ ان کی گرفتاری کے مخالف اور ان سے گفت و شنید اور مفاہمت کے ہمیشہ حامی رہے، ان کی رہائی اور انھیں دوبارہ برسر اقتدار لانے میں میر صاحب کی مساعی کو کافی دخل تھا، ان کے حق میں اقتدار سے دستبردار ہو کر انھوں نے حیرت انگیز مثال پیش کی، کشمیر سمجھوتہ میں مسز اندرا گاندھی اور شیخ عبداللہ کے اختلاف کے بارے میں یہ تاثر دیا ہے کہ شیخ صاحب کو دھوکہ دیا گیا، ایک باوقار علمی و دینی خانوادے سے تعلق رکھنے کی بنا پر میر صاحب کی شخصیت اور اس آپ بیتی پر مذہب، مذہبی تعلیم اور اسلامی تہذیب و روایت کے اثرات بھی ثبت ہیں، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلامی لٹریچر ان کے زیر مطالعہ رہتا ہے، اور وہ علامہ شبلیؒ، مولانا سید سلیمان ندویؒ، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور اس عہد کے دوسرے ممتاز اہل قلم کی کتابیں بھی پڑھتے رہتے ہیں، فارسی، اردو اور کشمیری شاعری کے مطالعہ کے شوقین اور اقبال کے عاشق و شیدائی ہیں، آپ بیتی کے ذاتی و خاندانی حالات خود انھوں نے قلمبند کئے ہیں، بقیہ حصہ کا انھوں نے املا کرایا ہے، جس کو ٹیپ ریکارڈر کی مدد سے جناب عبدالرحمن کوندو نے مرتب کیا ہے، گو کشمیر کی سیاست پیچیدہ اور متنازعہ فیہ رہی ہے، لیکن کوندو صاحب کی سعی و محنت سے اردو کے ذخیرہ میں ایک مفید اور پر از معلومات کتاب کا

اضافہ ہوا ہے۔ میر صاحب کی زندگی سیاسی ہنگاموں میں گذری ہے انھیں تقریر و خطابت کا جوہر دکھانے کا زیادہ اتفاق ہوا ہے، اسکا اثر اس کتاب میں بھی پایا جاتا ہے، مگر بعض اوقات تحریر میں یہ خطیبانہ انداز زبان کی سلاست و فصاحت کیلئے موزوں نہیں ہوتا، اس میں میر صاحب کی مختلف موقع کی تصویروں کا عکس بھی دیا گیا ہے، جن میں دوسرے رہنماؤں کی تصویریں بھی آگئی ہیں۔ ایک جگہ کچھ صفحات شامل نہیں اور بعض صفحے مکرر ہو گئے ہیں۔

اسلام کا تصور مساوات :۔ از مولوی سلطان احمد صاحب اصلاحی، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۲۴۴، قیمت ۲.۰۰ روپے، پتہ۔ مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی،

اس کتاب میں بتایا گیا ہے کہ موجودہ زمانہ میں آزادی و مساوات کا نعرہ تو ہر قوم و ملک میں بلند کیا جا رہا ہے، لیکن عملاً اس کے بالکل برعکس ہو رہا ہے، مصنف نے تفصیل و وضاحت سے ثابت کیا ہے کہ آزادی و مساوات کی اصلی و حقیقی تعلیم صرف اسلام نے دی ہے، اسی کی تعلیم و ہدایت سے عدم مساوات، طبقہ واریت اور ہر قسم کے فرق و امتیاز کا خاتمہ ہو سکتا ہے، اسلامی مساوات اور اس کے بارہ میں اسلامی تعلیم و ہدایت کی خوبیاں نمایاں کرنے کیلئے ابتدا میں یورپ میں نظریۂ مساوات کے عہد بعہد ارتقاء پر گفتگو کر کے اسکی اور دنیا کے مشہور مذاہب کے نظریہ مساوات کی خامیوں کی نشاندہی بھی کی گئی ہے، پھر اسلام نے مساوات کو فروغ دینے کے لیے جو مثبت و منفی اصول بیان کئے ہیں انھیں تفصیل سے بیان کیا ہے، اس سلسلہ میں اخلاقی ترغیبات اور قانونی تحفظات کی تفصیل اور اسلام میں تفوق و برتری کے معیار پر بھی سیر حاصل بحث کی ہے اور اسلامی تصور مساوات پر غلامی، جزیہ اور ازدواج میں کفاءت وغیرہ کے پہلو سے جو اعتراض کیا جاتا ہے، اس کا جواب دیا ہے، کتاب محنت سے لکھی گئی ہے، اور اپنے موضوع پر مفید ہے مگر اس کی بعض بحثیں مزید توضیح و تنقیح کی محتاج تھیں، مثلاً انسانوں کی خاندان و قبیلہ میں تقسیم کی حکمت پر گو لمبی بحث کی گئی ہے مگر یہ پوری طرح واضح نہیں ہو سکی ہے، جزیہ کے سلسلہ میں اگر وہ مولانا شبلی کی تنقیحات کو بھی سامنے رکھتے تو ان کا جواب زیادہ مدلل اور جامع ہوتا، ایک ہی

مفہوم و معنی کی بکثرت آیات و احادیث نقل کرنے کے بجائے ان کی جانب صرف اشارہ کر دینا کافی تھا، جس طرح مساوات کے بارہ میں قرآنی آیات و احادیث پیش کی گئی ہیں، اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے واقعات اور ان کی عملی زندگی سے مثالیں پیش کرنے کی ضرورت تھی، متن و حواشی میں مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی اور مولانا سعید احمد اکبر آبادی وغیرہ کا نام جس احترام سے لکھا گیا ہے اسی احترام کے مستحق مولانا شبلی بھی تھے۔

مولانا عبد الحئی فرنگی محلی :۔ مرتبہ جناب غلام مرسلین صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ کتابت و طباعت قدرے بہتر، صفحات ۲۰۰، قیمت ۴ روپے، پتہ: مصطفےٰ منزل، لال ڈگی، علی گڑھ۔

مولانا عبد الحئی فرنگی محلی متبحر علماء دین تھے، انھوں نے بہت کم عمر پائی مگر تصنیفات کا بڑا ذخیرہ یادگار چھوڑ گئے ہیں، جن سے حدیث و فقہ کا کوئی طالب علم بے نیاز نہیں رہ سکتا، مگر ابھی تک ان پر باقاعدہ کوئی کتاب نہیں لکھی گئی تھی، زیر نظر کتاب میں مولانا کی زندگی کے حالات اور کارناموں کو چار ابواب میں پیش کیا گیا ہے، پہلے باب میں خاندانی حالات، پیدائش، تعلیم و تربیت، معمولات، سفر، وفات اور اولاد و احفاد کا ذکر ہے، اسی ضمن میں مولانا کا شجرۂ نسب اور خاندان کے کئی اہم بزرگوں کا مختصر تذکرہ بھی دیا ہے، دوسرے باب میں اساتذہ اور مشہور تلامذہ کا مختصر حال تحریر کیا ہے اور غیر مشہور شاگردوں کے صرف نام گنائے ہیں، تیسرا باب زیادہ اہم ہے، اس میں مولانا کے اخلاق و عادات اور افکار و خیالات پر بحث و گفتگو کی ہے، اس سے مولانا کی اخلاقی خوبیوں، مذہبی و فقہی مسائل میں اعتدال و میانہ روی، بحث و تحقیق کے انداز، طریقۂ تصنیف اور بعض امور و مسائل میں ان کے نقطۂ نظر کا پتہ چلتا ہے، اسی باب میں مولانا کی تصانیف کی کثرت و مقبولیت بھی دکھائی ہے، اور ان کے فضل و کمال کے بارہ میں اہل علم کی رائیں نقل کی ہیں اور بعض معاصر علماء سے ان کے اختلافات کا تذکرہ کیا ہے، آخری باب میں فنون وار ان کی تصنیفات کا مختصر تعارف کرایا گیا ہے، اصل میں یہ ایم فل کا ایک مقالہ ہے، اور اس اعتبار سے اچھا ہے، لیکن اسکو مولانا

بھاری بھرکم اور بلند پایہ شخصیت کے شایان شان نہیں کہا جاسکتا ہے، بعض حوالے بھی غیر معیاری وغیر مستند کتابوں کے دیئے گئے ہیں، مولانا کے تلامذہ کے تذکرہ میں بعض خلاف واقعہ باتیں درج ہوگئی ہیں، ان کی تصنیفات کے تعارف میں زیر بحث مسئلہ کے متعلق کہیں کہیں مولانا کی رائے کا پتہ نہیں چلتا، اسی طرح مقالہ نگار نے جن کتابوں کے قلمی نسخے دیکھے ہیں ان کے بارہ میں یہ صراحت نہیں کی ہے کہ وہ مطبوعہ ہیں یا غیر مطبوعہ، امام ابوحنیفہؒ اور صاحبین کو ائمۂ ثلاثہ کہنا درست نہیں ہے، اس کا اطلاق امام صاحبؒ کے علاوہ تینوں مستقل صاحب مذہب ائمہ پر ہوتا ہے، یعنی امام مالکؒ امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کو ائمۂ ثلاثہ کہا جاتا ہے، اس موضوع پر مصنف کو ابھی اپنی محنت و کاوش جاری رکھنی چاہئے، تاکہ دوسرا اڈیشن زیادہ مستند اور محقق صورت میں چھپ سکے اور وہ موضوع کے شایان شان بھی ہو۔

متاع فکر:- از جناب عروج زیدی صاحب، متوسط تقطیع، کاغذ کتابت و طباعت اچھی صفحات ۱۶۰، مجلد مع گرد پوش، قیمت ۲۰ روپیے پتے (۱) عرفان زیدی محلہ کٹ کوئیاں شہر رامپور (۲) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، جامع مسجد دہلی، (۳) دانش محل امین الدولہ پارک لکھنؤ (۴) نظامی بک ایجنسی، محلہ سوتھ بدایوں۔

جناب عروج زیدی کے کلام کے متعدد مجموعے چھپ چکے ہیں، اب انھوں نے اپنی تازہ "متاع فکر" کو صحتمند جذبہ و خیال کے حامل اصحاب ذوق کی نذر کیا ہے، وہ جدیدیت اور ترقی پسندی کے شور و ہنگامہ سے کان بند کرکے شاعری کی قدیم پاکیزہ روایتوں اور اخلاقی و تہذیبی قدروں کو حرز جان بنائے ہوئے ہیں، انھوں نے غزل کو اپنا موضوع فن بنایا ہے، ان کے تغزل میں صداقت پر مبنی جذبات کی ترجمانی کی گئی ہے، اور ان کا خیال اور طریقہ بیان ابتذال اور عدم توازن سے خالی ہے، قدیم و جدید کے امتزاج سے انھوں نے اپنے اسلوب کو تازگی عطا کی ہے، ان کے نزدیک حسن خیال اور حسن بیان کے بغیر حسن کلام تشنۂ تکمیل رہتا ہے، ان کی غزلوں کی کیف آفرینی و دلکشی کا راز فکر و فن کی آرائش میں پنہاں ہے، مسائل حسن و عشق کی طرح ان کی غزلوں میں نئے دور کی تصویر بھی نظر آتی ہے، ان میں آدمی کی عظمت کا تصور اور خودداری و عزم و حوصلہ کی تلقین ملتی ہے، انھیں اسکا دکھ ہے کہ انسان نے اپنی عظمت و حیثیت کو بھلا دیا ہے، وہ خودشناس اور حق نوا نہیں رہا، وہ اخلاقی و تہذیبی قدروں سے دامن کش ہوگیا ہے، اور درد و غم کے لذت شناس کم ہوگئے ہیں، ظاہر و باطن میں تضاد و منافقت اور دورخاپن عام ہے، موجودہ بہار میں خزاں کا منظر دکھائی دیتا ہے، عشق و محبت کے لطیف اور بلند جذبات پر ہوا و ہوس اور جنون و مستی پر مصلحت اندیشی غالب ہوگئی ہے، عروج صاحب کا کلام اپنی خوبیوں کی وجہ سے قابل مطالعہ ہے۔

جلد ۱۳۸ ماہ صفر المظفر ۱۴۰۷ھ مطابق ماہ اکتوبر ۱۹۸۶ء عدد ۴

مضامین

مقالات